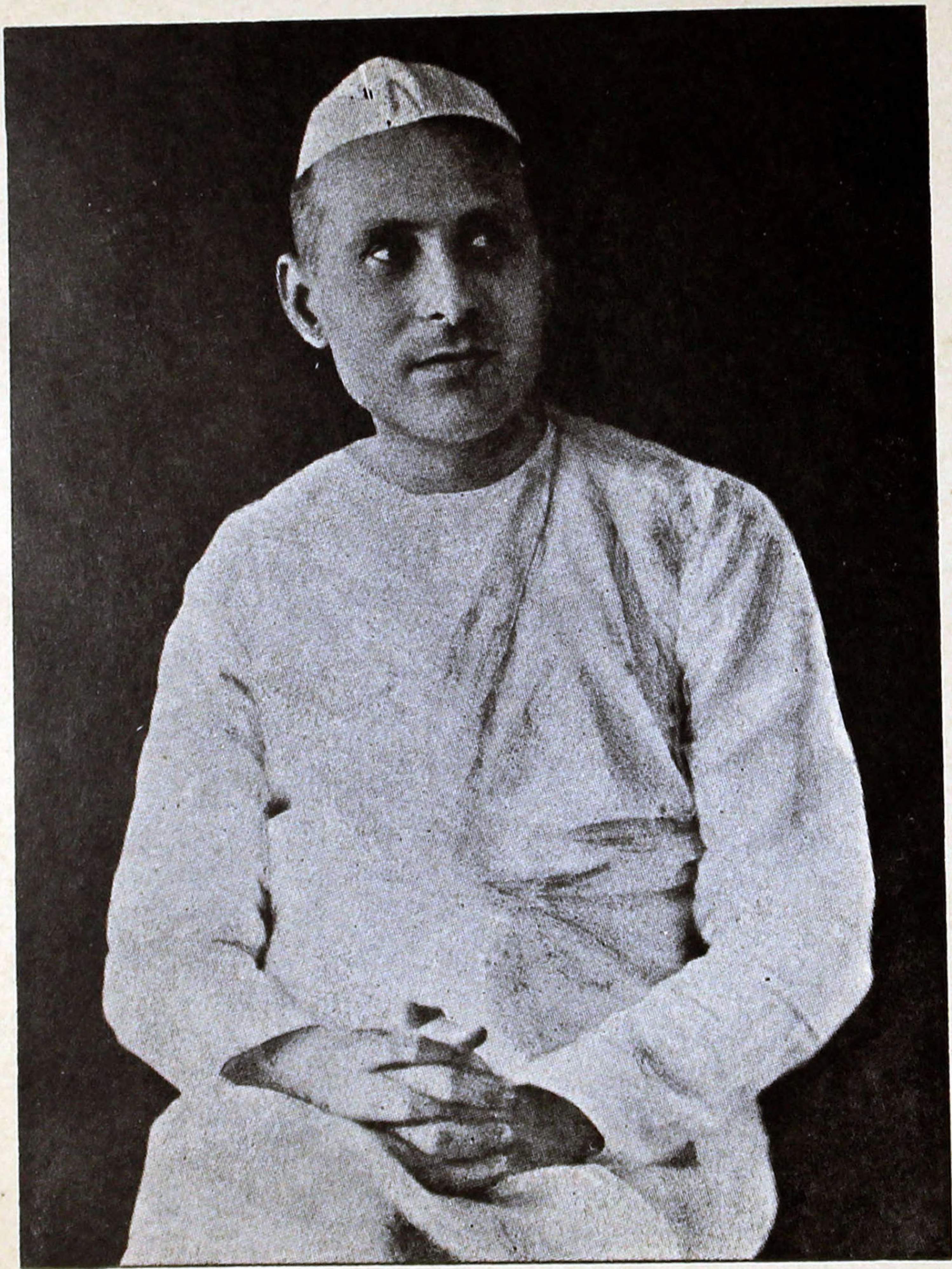
شبِ بیداری

از
کلبِ مصطفیٰ
ایڈووکیٹ

شب بیداری

از

سیّد کلب مصطفیٰ
ایڈووکیٹ



عکس مصنف

بار اوّل   جون ۱۹۵۹ء

پرنٹر

سرفراز قومی پریس، لکھنؤ۔

پبلشر

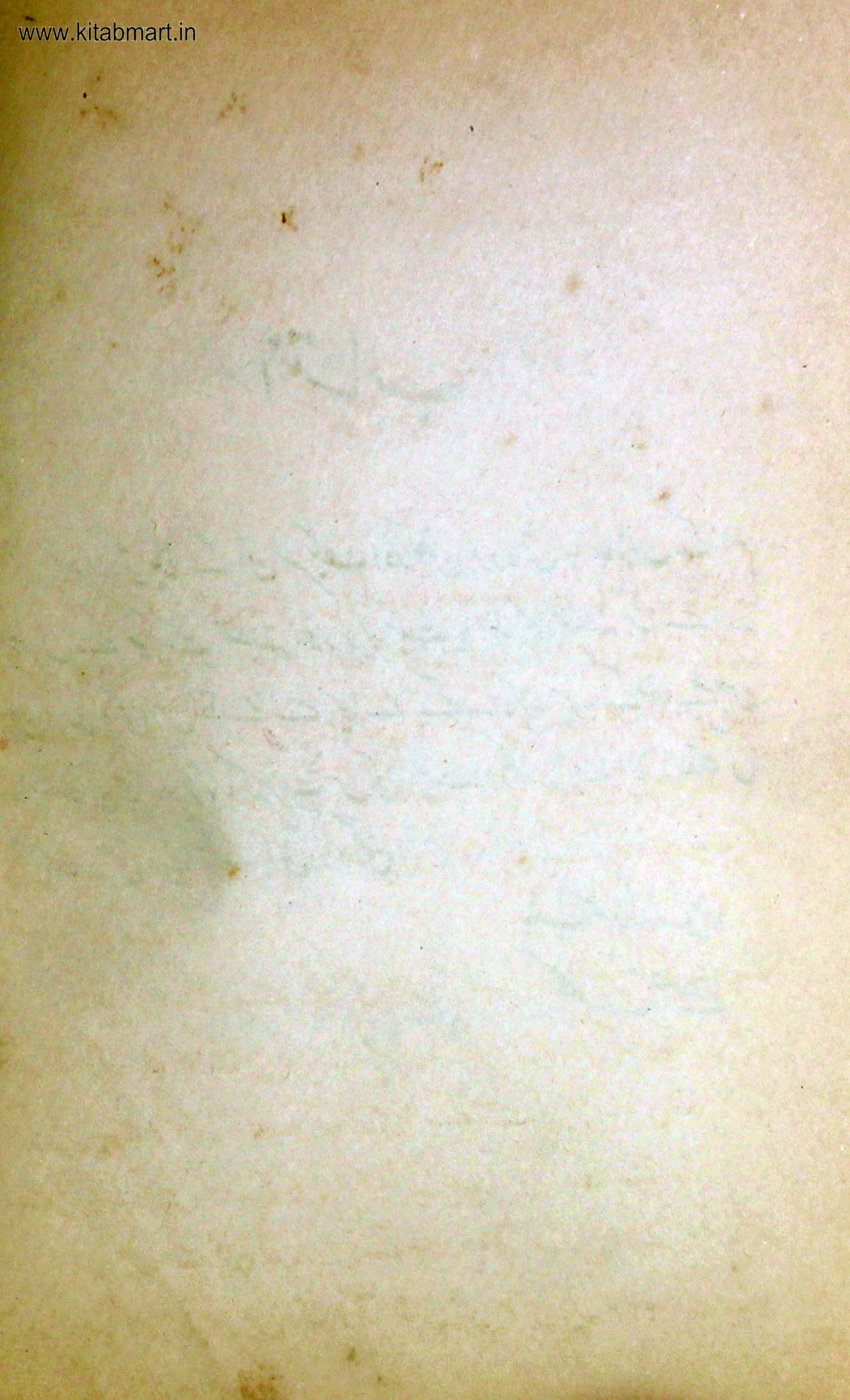
احباب پبلشرز، مقبرہ عالیہ گولا گنج لکھنؤ۔

قیمت:۔ ایک روپیہ آٹھ آنے۔

انتساب

معرکۂ کربلا کے اُن سر بکف اور کفن بر دوش جانبازوں کے نام جنھوں نے ملوکیتِ مطلقہ اور ربوبیتِ باطلہ کا طنطنہ مٹانے اور دینِ اسلام کو اس نظریے سے بچانے کے لئے یزیدیت کے مقابلے میں وہ فیصلہ کُن مجاہدہ فرمایا کہ عزتِ نفس کی منزلت اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی عظمت رہتی دنیا تک باقی رہ گئی۔

باب العلم کا گدائے بینوا
کلبِ مصطفےٰ



دیباچہ

شہر جونپور مفتی محلے میں ایک مدّت سے ہر سال ساتویں ربیع الاول کو انجمنِ سجّادیہ کے زیرِ اہتمام ایک "شب بیداری" ہوتی ہے۔ اس میں مختلف حضرات مقرّرہ موضوعات پر واقعۂ کربلا کے متعلق تقریریں کرتے ہیں۔ جن میں اِس واقعۂ ہائلہ کے مختلف پہلو شاں شب بیان ہو جاتے ہیں۔ اِس "شب بیداری" کی ایک خصوصیت مقرّرین کے لئے مدّتِ بیان کا تعیّن بھی ہے۔

اِدھر کئی سال سے مجھے بھی اس "شب بیداری" میں شریک ہونے اور تقریر کرنے کا اتفاق ہو رہا ہے۔ میری بارہ تقریریں جو اس کتابچے میں ہیں اُن میں سے نو اِسی "شب بیداری" کے سلسلے کی ہیں۔ اِسی مناسبت سے میں نے اِس کتابچے کا نام "شب بیداری" رکھا ہے۔

اِن میں سے تین تقریروں کے علاوہ باقی تقریریں اخبار "سرفراز" لکھنؤ اور "رضاکار" لاہور میں وقتاً فوقتاً شایع بھی ہو چکی ہیں۔ اب اُن کو یکجا

کر کے ضروری اصلاح و اضافہ کے بعد پیش کیا جا رہا ہے بعض جگہ دو دو تقریروں کو ایک میں سمو دیا ہے اور عنوان میں بھی جزوی تغیّر و تبدل کر دیا ہے۔ عنوان کے ساتھ موضوع اور اس کے سامنے "شب بیداری" کے سن کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔

گو عام طور پر ایسی فکری کوششوں اور ذہنی کاوشوں کو جو رائج الوقت اندازِ فکر سے ہم ساز اور مذاقِ عام سے ہم آہنگ نہ ہوں پسند نہیں کیا جاتا لیکن میں اپنی اِن مجلسی تقریروں کو محض اِس خیال سے شائع کر رہا ہوں کہ

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اب اِس اقدام میں کوئی افادیت بھی ہے یا نہیں یہ میرے کہنے کی نہیں دوسروں کے طے کرنے کی بات ہے۔ افادیت ہو یا نہ ہو جذبۂ مودت کی کارفرمائی تو بہرحال ہے۔

لکھنؤ
۱۴؍ جون ۱۹۵۹ء

کلبِ مصطفےٰ

عنوانوں کی فہرست

(۱)

حسینؑ کی عظمت

اور

معرکۂ کربلا میں آلِ ابوطالبؑ کی اہمیّت و منزلت!!

انسان کی عظمت دراصل اُس کی حیثیت، وراثتی خصوصیت، تعلیم و تربیت، ماحول و معاشرت اور قول و عمل کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ اِن عناصر میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حدّ تک انسان کی عظمت کے درجات معیّن کرنے اور اُن کی بلندیوں کو بڑھانے یا گھٹانے کا سبب ہوتا ہے۔ مگر جب تک اور عناصر بھی موجود نہ ہوں صرف ایک ہی عنصر فضیلتِ انسانی کا معیار نہیں بن سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا شخص بُرا اور ایک جاہل اچھا ہو۔ یہ بھی لازم نہیں کہ اچھے والدین کی اولاد بھی اچھی ہو۔ یا بُرے ماں باپ کے بچّے بُرے ہی ہوں۔ اِسی طرح بعض طینتیں تربیت کا اچھا اثر لیتی ہیں اور بعض اُلٹا۔ البتہ قول و عمل انسان کی عزّت کو بڑھانے یا گھٹانے کے لئے مؤثر آلات ہیں۔ انسان اپنے اقوال و اعمال سے تعلیم و تربیّت کے آئینے اور وراثتی نگینے پر جِلا بھی کر سکتا ہے اور اُن کو دھندلا بھی۔ نیک پیدا ہو کر بد بن سکتا ہے

اور بدوں کی آغوش میں پرورش پاکر اپنے گفتار و کردار کی بدولت اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جس میں جوہرِ ذاتی بھی ہو اور وصفِ اضافی بھی۔ تعلیم بھی بے نظیر ہو اور تربیّت بھی تو پھر وہ جوہرِ تابدار ہی نکلے گا اور حسینؑ ایسے ہی تھے۔

عرب کے بہترین اور معزز ترین خاندان میں ہجرت کے چوتھے سال (مطابق ۶۲۶ء) تیسری (۳) شعبان کو پنجشنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی۔

نانا وہ جس نے انسانیت کو پیغامِ اسلام سنا کر زنگ آلودہ دماغوں کی جلا کی۔ اور لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ بلند کر کے مصنوعی خداؤں کی تکذیب کر دی۔ جس نے عزم و استقلال سے صبر و رضا کی مشکل منزلوں کو آسانی سے طے کیا۔ اور جس نے قابو پاکر بھی دشمن پر سختی نہ کی۔ جو مجسمۂ اخلاق، پیکرِ حلم و مروّت، عینِ حق اور مظہرِ رحم و الطاف تھا۔ دادا وہ جس نے پیغمبرِ اسلام کے مقابلے میں اپنی اولاد کی جانوں تک کی پروا نہ کی اور جس نے ابد الآباد تک اپنی حق گوئی، حق دوستی، حق شناسی اور یتیم پروری کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔

ماں وہ جس کی تعظیم خود رسولِ خداؐ کرتے تھے اور جن کے اعمال و کردار عورتوں کے لئے معاشرتیات یا تدبیرِ منزل کے منارے بنے ہوئے ہیں۔ حسینؑ کی ماں اُس خاتون کی لختِ جگر تھیں جس نے شجرِ اسلام کی آبیاری اور نشوونما میں کسی دوسرے سے کم حصہ نہیں لیا اور جو اُس وقت رسالت کی گواہ بنی جب دُنیا رسولؐ کو جھٹلا رہی تھی۔

باپ وہ جس کی تلوار اور کردار کے احسان سے اسلام کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ جس نے اسلامی غزوات میں سے دو ایک کے علاوہ سب ہی میں شرکت کی اور سب ہی کو سر کیا۔ جس نے راہِ حق میں جانفروشی و جاں سپاری کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ جس نے رسولِ اسلامؐ کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور جو نہ صرف شجاع بلکہ رسول کے بعد سب سے بہتر ادیب، حکیم، عالم، فلسفی اور مدبّر تھا۔

ایسے ماحول، ایسے خاندان اور ایسے ماں باپ کے گھر پیدا ہونا ہی حسینؑ کی بلندیٔ عظمت کے لئے کافی تھا۔ چہ جائیکہ سینتیس سال تک یکے بعد دیگرے جو آغوشِ تربیت بھی ملی اُسے نورٌ علی نور ہی کہہ سکتے ہیں سب سے زیادہ مدّت علیؑ جیسے یگانۂ روزگار اور مظہرِ پروردگار کے زیرِ تربیت گزری اور تربیت بھی کیسی، جنگ کی بھی اور صلح کی بھی، فاقہ کشی کی بھی اور حق کوشی کی بھی، علم کا بھرا بھی کھلتے دیکھا اور گلے میں رسّیاں بندھتے بھی۔ ماں کو نانا کی وفات کے بعد ایذا پہونچتے بھی دیکھا اور باپ کے ساتھ ناقابلِ برداشت بدسلوکی بھی۔ علمی مسائل کی گتھیوں کو سلجھتے بھی دیکھا اور اسلامی مسائل کو علیؑ کی مدد کے بغیر اُلجھتے ہوئے بھی۔ یہاں تک کہ سنہ ۴۰ھ (مطابق سنہ ۶۶۱ء) میں سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تو خلافت کو سلطنت بنتے، بھائی کو مصالحت کرتے، لگن میں بھائی کے جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرتے اور انجامِ کار بھائی کے جنازے پر تیر برستے بھی دیکھے۔ لیکن بھائی کی صلح جو سرشت کے پیشِ نظر اور فساد و شر کو بچانے کے

خیال سے باوصف امکان مدافعت تک نہ فرمائی اور بھائی کے جنازے کا رُخ روضۂ رسولؐ سے جنت البقیع کی طرف موڑ دیا۔ اِس طرح بھائی کی شہادت کے وقت یعنی تقریباً چھیالیس سینتالیس برس تک حسینؑ نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے اور جنگِ صفین و جمل اور صلح حسنؑ سے بڑے بڑے سبق لے چکے تھے۔ اِس کے بعد دس برس کی طویل مدت تک محض عبادت و ریاضت میں بسر کرنا اور ایسے قنوت[۱] اور اشعار[۲] کا وِرد رکھنا

---

[۱] "۱۔ خداوندا! اگر تیرے سوا کوئی کسی کی پناہ لیتا ہے تو لے۔ میری جائے پناہ تو ہے اور صرف تو۔ کوئی شخص دوسرے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے تو ڈھونڈھے میرا سہارا تو تیری ذات ہے اور صرف تیری ذات، امتحان و ابتلا میں کسی فتنے سے دوچار ہونے یا گروہِ شیاطین کی دراندازی سے تو میری حفاظت کر یہاں تک کہ تو مجھے اپنی طرف پلٹائے، اس طرح کہ میرے دل میں نہ فاسد خیالات ہوں، نہ ابنائے زمانہ میری نسبت بُرے خیالات قائم کریں۔ نہ میں دوسرے کی طرف سے شک میں رہوں نہ میری طرف سے دوسروں کو شک ہو۔"

۲۔ "تو جو فیصلہ میرے حق میں کر چکا ہے میں اُسی پر راضی ہوں جس راستے پر تو مجھے چلاتا ہے میں تو اُسی پر چلتا ہوں۔ تو نے میرے دل میں جس چیز کا قصد دار دکیا ہے اُسی کا قصد رکھتا ہوں۔ میں اُن باتوں میں جو تیری رضامندی کا باعث ہوں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتا اور نہ اپنی جدّ و جہد کا کوئی دقیقہ تیرے احکام کی تعمیل میں اُٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ جو راستہ تو نے مجھے بتا دیا ہے اُسی پر تیری سے چلتا ہوں۔ جو مقصد تو نے مجھ پر واضح کر دیا ہے میں اُسی پر برابر نظر رکھتا ہوں۔ جن ذمہ داریوں کو تو نے میرے سپرد کر دیا ہے میں اُن سے عہدہ برآ ہونے کی مسلسل کوشش کرتا ہوں۔ اب تو اپنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ ہو)

جن سے انتہائے عبودیت کا پتا چلتا ہو۔ بجائے خود عظمتِ حسین کی روشن دلیلیں ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲)

نگہبانی سے مجھے محروم نہ کر اور اپنی توجّہ کے دائرے سے مجھے باہر نہ نکال۔ اور مجھے درماندہ و عاجز نہ ہونے دے اور اُس مقصد سے مجھے علیحدہ نہ کر جس کے واسطے میں تیری مشیّت پوری کرنا چاہتا ہوں۔ میری رضا کو بصیرت کا تابع رکھ اور میرے مسلک کو اپنے منشاء کے مطابق بنا۔ میرے راستے کو صحیح منزل کی طرف موڑ یہاں تک کہ مجھے میری آرزو تک اور اُس محل تک پہونچا دے جس کا تو نے میرے لئے ارادہ کیا ہے اور مجھے اُس مقام پر اُتار دے جہاں کے لئے تو نے مجھے خلق کیا ہے اور جس کی طرف تو نے میرا رخ موڑا ہے۔"

(از مہج الدعوات سید ابن طاؤس مطبوعہ بمبئی)

ملہ اشعار:۔ "خدا سے لَو لگا اور مخلوق سے بے نیاز ہو جا۔ اِس کے بعد تجھے کسی جھوٹے سچے کی پروا نہ رہے گی۔ مانگنا ہے تو خدا ہی سے مانگ۔ خدا کے سوا کوئی رزق دینے والا نہیں۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہو کہ بندے اُسے غنی کر دیں گے وہ درحقیقت خدا پر اعتماد نہیں رکھتا اور جو یہ سمجھتا ہے کہ لوگ اُس کی کفالت کے لئے کافی ہیں وہ یقیناً پستی میں گرنے والا ہے"۔ "جب زمانے کے دانت تمھیں کاٹیں اور زمانہ تمھیں حوادث کا نشانہ بنائے تو مخلوق کی طرف کبھی نہ جھکو۔ اور اُس خدا کے علاوہ جو رزق بانٹنے والا ہے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرو۔ کیونکہ اگر تم مشرق سے مغرب تک کا چکّر لگاؤ گے تب بھی تم کو کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو مقدر کو بنا بگاڑ سکتا ہو۔"

نوٹ:۔ یہ قنوت اور اشعار قدرے تغیرِ الفاظ کے ساتھ مولانا اختر علی تلہری کے اُس مضمون سے ماخوذ ہیں جو پہلے اخبار سرفراز لکھنؤ کے کسی محرم نمبر میں شایع ہوا تھا اور پھر مولانا کی تصنیف "علوی تصورات" میں شامل کیا گیا۔

دلوں میں لرزہ ڈال دینے والی فداکاری و سرفروشی کا جذبہ اُن کی سیرت میں اِس قوت کے ساتھ موجود تھا کہ اُس کے مقابلے میں دنیوی حکومت و اقتدار سب ہیچ نظر آتے تھے۔ اُن کی زندگی خالص عبدیت کی مکمل تفسیر تھی اور غیرِ خدا کا کوئی دور کا بھی تصور اُن کے ذہن میں نظر نہیں آتا تھا۔

خدا کی طرف اُن کے اس قدر مکمل کھنچاؤ، دل و دماغ کے اتنے کامل جھکاؤ، تسلیم و رضا کے مُحیرّ العقول حد تک لگاؤ، ماسوا المعبود سے کامل بے نیازی کے مشاہدے کے بعد بارگاہِ حسن میں امکان کہاں تھا کہ اِن کے علی الرّغم کوئی دوسرا باریاب ہو سکے خواہ وہ کیسا ہی صاحبِ جبروت اور کتنی ہی قوت و طاقت کا مالک کیوں نہ ہو۔

خدا کی ربوبیّت کے اِس شدید احساس کے بعد ایسا بلند کردار اور صلح پسند انسان اپنی حق تلفی برداشت کر سکتا ہے، ایک غاصب بادشاہ کی انفرادی بے راہ روی، اُس کی بدکرداری اور معاصی سے غضِ بصر کر سکتا ہے لیکن نہیں کر سکتا تو یہ کہ انسان کو انسان کا ربّ مانے اور کسی انسان کی خدائی کا تسلّط گوارا کرے کیونکہ یہ صورتِ حال زبان و ضمیر کی آزادی کے اُس فطری بنیادی حق کے لیے پیامِ اجل ہے جس کے بغیر انسان انسان نہیں رہ جاتا۔

کارِ خداوندی کی انجام دہی کے لیے جس آگہی کی ضرورت ہے اور جو بے غرضی، بے لوثی اور بے نیازی درکار ہے وہ عام انسانوں میں کہاں ہو سکتی ہے۔ اِسی لیے انسان کے خدا بن جانے کا لازمی نتیجہ مُطلق العنانی اور ظُلم کا دَور دورہ

ہوتا ہے۔ وہ تو خدا بننے کا شوق ہی مطلق العنانی کے جذبے سے پیدا ہوتا ہے تو اب ظاہر ہے کہ انسانِ مطلق العنان کی خدائی میں ضعیف کو کس مپرسی اور بے موت مرنے کے سوا اور کیا میسر ہو سکتا ہے۔

ادّعائے الوہیت میں نہ یقین ہوتا ہے نہ آگہی، نہ بے لوثی ہوتی ہے نہ بے غرضی، نہ بے نیازی ہوتی ہے نہ صدق آگینی، بلکہ کسی نہ کسی عنوان سے ظلم، عدوان، بے اعتدالی، بے راہ روی، غلط نگاہی، ناہمواری، ناحق اندیشی، مصلحت بینی، قابو پرستی اور نہ معلوم کتنی انسانی کمزوریاں عجیب عجیب انداز سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ نتیجے میں انسانی جسم اعمال و کردار کے اعتبار سے نفسِ امّارہ کا تابع اور غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اور انسانی رُوح اپنی فطری آزادی اور ازلی حقوق سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ دنیوی اعتبار سے بھی انسان نفس پرستیوں اور خود غرضیوں کے شکنجے میں دب کر ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ایسی اندیشہ ناک صورت حال یوں تو تمام انبیائے ماسلف اور خود ہمارے رسولِ مقبول کو بھی پیش آئی نیز آپ کے کنبے کے دوسرے افراد کو بھی کم و بیش اسی قسم کے حالات سے سابقہ ہوا لیکن جب سنہ ۶۰ھ (مطابق سنہ ۶۷۹ء) تک اسلام کی کشتی جس گرداب تک پہنچ چکی تھی وہ پہلے سے کہیں زیادہ نازک اور بڑھ چڑھ کر تھی۔ نام نہاد اسلام والوں کی ذہنیتیں بالکل بدل چکی تھیں اور اس

قلبِ ماہیت نے "یزید" کی شکل میں متشکّل ہو کر تمام وہ حجابات بھی دُور کر دیئے تھے اور وہ سارے پردے بھی اُٹھا دیئے تھے جن کے پیچھے اِسلام کے نام سے ربوبیت و ملوکیتِ باطلہ کارفرما تھی۔ لہٰذا ایک سچے مسلمان کی ذمہ داریاں اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہوئی حسینؑ کے سامنے کُھل کر آگئی تھیں اور اُن حقوق کی ادائی بہ نسبت پہلے کے دشوار ہی نہیں بلکہ ایک مرحلۂ عظیم تھی۔ پیغمبرِ اسلام کو سابقہ کُھلے ہوئے کافروں سے تھا مگر اب مقابلہ اُن گمراہوں سے تھا جو اپنے کو مسلمان کہتے تھے۔ پہلے مشرکوں اور کافروں کے چھوٹے چھوٹے بتوں کو توڑنا تھا اور اب ملوکیت و شہنشاہیت کے سب سے بڑے اور خطرناک بُت کو ٹھکانے لگانا تھا۔ تب ابوجہل اور ابولہب ایسے کافر درپئے تخریب تھے اور اب یزیدؔ و ابن زیادؔ جیسے مدّعیانِ اسلام۔ بہر حال اب عالم ہی دوسرا تھا اور عہدِ یزیدؔ کے طوفانی دریائے ضلالت کا مقابلہ کرنا کچھ آسان نہیں بڑا دشوار تھا۔ مگر دشوار ہو یا مُحال، کچھ بھی ہو حسینؑ ایسے خداپرست و خداشناس مصلح سے ممکن کہاں تھا کہ وہ اِن بدعتوں، بد اعمالیوں اور فرعونیت سامانیوں کے استیصال پر کمربستہ نہ ہو جائیں جن کا تمام تر رجحان ببانگ دُہل اسلام میں ملوکیتِ باطلہ کے زہریلے عناصر داخل کرنے اور جبر و تشدد نیز غلبے سے حکومت کرنے کی طرف تھا۔ اور جن کے بل بُوتے پر یزیدؔ نے شہنشاہ بن کر آخر میں خلیفۂ اِسلام کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ اِس خطرناک صورتِ حال سے انسان کو

بچانے اور قعرِ مذلّت میں گر جانے سے محفوظ رکھنے کا ایک ہی علاج ہو سکتا تھا کہ کوئی مردِ میدان کلمہ " لا الٰہ الّا اللہ " کو از سرِ نو زندہ کر کے اُس میں ایک لازوال قوت بھر دے اور انسان کو اس غلامی کی جکڑبند سے آزاد کر دے۔ مگر سوال یہ تھا کہ اِس صورتِ حال کے خلاف احتجاج کون کرے اور یہ پہاڑ کون کاٹے۔ عام طور پر مسلمانوں کے ضمیر ذاتی مصلحتوں اور مجبوریوں نیز حکومت کی ریشہ دوانیوں اور ستم رانیوں سے متاثر ہو کر مُردہ ہو چکے تھے اور ان میں دم نہ تھا کہ سر سے کفن باندھ کر اِس کس مپرسی کے عالم میں اسلام کی مدد کو نکل پڑتے۔ لے دے کے نظر پڑتی تھی تو بس آلِ ابوطالبؑ اور اُن کے اپنے گنے بعض رفقاء وانصار پر۔ مگر اُن کے لئے زحمت یہ تھی کہ اُن کا نسبی تعلق بنی ہاشم سے تھا اور یزیدِ لعین بنی اُمیّہ سے تھا اور اِن دونوں کے اجداد میں باہم موروثی چشمک تھی۔ اِس صورت میں ابو طالب کی اولاد کا یزیدِ لعین سے بیعت نہ کرنا اور اُس کے اقدامات کی مخالفت کرنا اِس پر محمول کیا جا سکتا تھا کہ بنی ہاشم اور بنی اُمیّہ کی دیرینہ دشمنی کی بنا پر ایسا کیا جا رہا ہے پھر خروج اور حصولِ سلطنت کی خواہش کا الزام بھی عاید ہو سکتا تھا۔ غرض اُن کے لئے معاملہ محض جسدِ اسلام سے ملوکیت کے زہریلے عنصر کو دفع کرنے ہی کا نہیں بلکہ مناسب عنوانِ مقابلہ اور موزوں طریقۂ کار کا بھی تھا تاکہ اس قسم کے شکوک بھی پیدا نہ ہوں اور حق و باطل کی یہ جنگ اپنے نتائج کے اعتبار سے فیصلہ کُن بھی ہو۔

اور یہی بہت دشوار تھا۔ لیکن مسئلے کی اہمیّت کا اندازہ کر کے یہ سمجھتے ہوئے کہ اس خطرناک صورتِ حال کے خلاف پُرزور احتجاج کا حق اپنے خاندانی روایات کے مطابق اور پیغمبر اسلام کے ورثہ دار ہونے کی حیثیت سے انھیں کو ہے۔ اولادِ ابو طالب کے سردار امام حسینؑ تمام مشکلات اور مزاحمات کے باوجود اس یزیدی ذہنیت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے اللہ کا نام لے کر سر بکف اٹھ کھڑے ہوئے اور ایسا سوچا سمجھا، جچا تُلا قدم اُٹھایا کہ کسی منصف مزاج کے لئے تو ایراد و اعتراض کی کوئی گنجایش باقی نہ رکھی اور اپنے احتجاج کی صداقت اور کردار کی استقامت کا غیر فانی نقش صفحاتِ تاریخ پر ثبت کر دیا۔

حسینؑ کو ولید حاکمِ مدینہ کا پیغامِ ملاقات ملا۔ اُس نے امیر معاویہؓ کے انتقال کی خبر سنائی۔ آپ نے کلمۂ اِنَّا لِلّٰہِ زبان پر جاری فرمایا۔ پھر ولید نے یزید کی بیعت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا "تم یہ تو پسند نہ کرو گے کہ مجھ سے چُپ چاپ اور پوشیدہ طور سے بیعت لے لو۔ جب اور اہلِ مدینہ کو اس غرض سے بلوانا تو مجھے بھی اطلاع کر دینا"۔ اس پیغام کے بعد زیادہ سوچنے یا غور کرنے کا موقع نہ تھا۔ حسینؑ کے لئے یہ وقت بہت سخت تھا کہ انکارِ بیعت کو کس طرح ناقابلِ انکار کامیابی کے ساتھ بروئے کار لائیں۔ غلبے کا مقابلہ غلبے سے کیا جائے۔ جبر کا سر جبر سے کچلا جائے۔ یا قوّت کا مقابلہ استقامت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے کیا جائے۔

یہ ممکن تھا کہ جماعتیں فراہم کی جاتیں، مددگار اکٹھا کیے جاتے، عرب کے گوشے گوشے میں یزیدؔ کی بداعمالی و بدکرداری کو طشت ازبام کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اُس کی مخالفت پر آمادہ کیا جاتا اور آخر کار یزیدؔ کو شکست دے کر مسندِ خلافت قبضے میں کر لی جاتی۔ لیکن یہ تو غلبے کو غلبے ہی سے ختم کرنا ہوتا۔ جو دورِ تسلسل کا مرادف ہونے کے علاوہ اہلِ زمانہ کے شیوۂ فرسودہ کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اور اس طور پر ممکن تھا کہ یہ عارضی کامیابی ابدی ناکامی کا پیش خیمہ بن جاتی۔ لہٰذا حسینؑ نے ایک دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ مادّی ہتھیاروں کے بجائے رُوحانی حربے بہم کیے، ظلم کا مقابلہ مظلومی سے کرنا طے کیا۔ قوّت و جماعت کے مقابلے کے لئے استقامت و بیکسی کو، بہیمیّت کے مقابلے کے لئے انسانیت کو اور شیطنت کے مقابلے کے لئے حقانیت کو اپنا رفیقِ کار بنایا۔ اور اس راہِ حق میں قدم قدم پر جو گوناگوں مزاحم در پیش تھے اُن میں کوئی ایک بھی حسینؑ کو اُن کے ارادے سے باز نہ رکھ سکا، کوئی دہشت انھیں روک نہ سکی اور کوئی قوّت اُنھیں اس صراطِ مستقیم سے ہٹا نہ سکی

سر داد و نہ داد دست در دستِ یزیدؔ۔

ولیدؔ کے یہاں سے حسینؑ گھر واپس آئے۔ اگلے روز روضۂ رسولؐ پر گئے۔ السّلامُ علیکَ یا رسولَ اللہ کہتے ہوئے نانا کے روضے میں داخل ہوئے اور قبرِ رسولؐ کی طرف رُخ کر کے رُوحِ رسولؐ سے

یوں شکوہ طراز ہوئے جیسے کوئی بچہ اپنے بزرگ سے۔ "میں ہوں آپ کی چہیتی بیٹی کا بیٹا۔ آپ نے مجھے جس اُمّت کے سپرد کیا تھا اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ نانا! مجھے اپنی قبر میں لے لیجئے۔" اور پھر روتے روتے سو گئے تو خواب میں رسولؐ کو اپنا منتظر پایا۔

دوسرے دن ماں اور بھائی کی قبر سے رخصت ہو کر روضۂ رسول ہیں آخری رخصت کو آئے۔ اور پھر سر فروشوں اور مجاہدوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مرتب کر کے مدینے سے چل کھڑے ہوئے۔ وہ مدینہ جو عزیزوں، پیاروں اور بزرگوں کا مسکن و مدفن تھا، جو مرکزِ علم و فضل تھا، جس کے در و دیوار سے فصاحت و بلاغت کی صدائے بازگشت کانوں میں آتی رہتی تھی وہی مدینہ آج حسینؑ سے چھُٹ رہا تھا اور اہلِ مدینہ سے وہ امامِ عالی مقام اور ہادیٔ برحق جو فاطمہؑ کی گودوں کا پالا تھا اور رسولؐ اور علیؑ کی حقانیت کا آئینہ دار۔ جو علم و عمل میں فرد تھا اور زہد و ورع میں یکتائے روزگار۔ جو سخا وجود میں مُمتاز تھا اور مساکین اور اہل حاجت کے لئے منزلِ سکون و قرار تو اس جُدائی پر طرفین کے جذبات میں جو بھی ہیجان اور دلوں میں غم و اندوہ کا جو طوفان بھی برپا نہ ہوتا کم تھا۔ اہل مدینہ بھی دل ملول اور حزین تھے اور حسینؑ بھی متالّم و غمگین۔ اور دھڑکتے ہوئے دلوں کا کیا ذکر ساکت و جامد در و دیوار پر بھی افسردگی و بے رونقی چھائی

ہوئی تھی۔ مگر اہلِ مدینہ کی جرأتِ اخلاق کے جیسے جیسے مظاہرے حسینؑ کے سامنے آ چکے تھے اُن کے پیشِ نظر حسینؑ کا مدینے میں قیام کرنا شدید خطرات سے خالی بھی تو نہ تھا۔ حسینؑ مدینہ نہ چھوڑتے تو کیا کرتے۔ بہر حال حسینؑ مدینے سے روانہ ہو گئے۔ اور یہی نہیں کہ آپ نے اپنے ساتھیوں کے انتخاب میں اپنے بلند مقصد اور اپنی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا بلکہ فطرتِ انسانی کی نازک سے نازک اور مشکل سے مشکل منزل پر بھی جادۂ اعتدال سے سرِ مو تجاوز نہ فرمایا۔ لشکر جمع کرنا تو درکنار مدینے سے بھی غیروں میں سے کسی ایک کو بھی ساتھ نہ لیا اور محض اپنے آزمودہ کار عزیزوں اور غلاموں کے ہمراہ بعض ہمدردوں کی مخالفت کے باوجود عورتوں اور بچّوں کو بھی ساتھ لے کر تقدّم بالحفظ کے خیال سے مکّے آ گئے۔ مگر اندیشہ ناک صورتِ حال کا احساس کر کے مکّے کو بھی خیر باد کہا۔ اگرچہ یہاں سے اور حضرات بھی آپ کے ساتھ ہو گئے تھے مگر جب آپ کربلا پہونچے تب بھی آپ کی جماعت کی تعداد سَو تک نہ پہونچی اور یہ تعداد ہزار بلکہ دس ہزار بھی ہو گئی ہوتی تو بھی یزیدؔ ایسے با اقتدار بادشاہ کے لاکھوں کے لشکر کے مقابلے میں بھلا کس شمار میں آتی۔ دوسری احتیاط حسینؑ نے یہ برتی کہ جن لوگوں کو آپ نے اپنے ساتھ لیا یا جو آپ سے آکر ملے وہ مختلف نسلوں اور مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے کے علاوہ سب کے سب وہی تھے جو مسلّم طور پر پابندِ شرع، حافظِ قرآن، عابدِ شب زندہ دار اور عموماً مُعمّر تھے۔ گو

حبیب ابن مظاہر، مسلم ابن عوسجہ، نافع ابن ہلال جیسے زاہدوں اور عابدوں کا اس جہاد میں حسینؑ کے ساتھ ہونا ہی کسی ایسے الزام کی تردید کے لئے کافی تھا جسے ایک خلافِ شریعت اقدام کہیں۔ مگر اس کے باوجود آپ بار بار ساتھیوں کو چلے جانے کا مشورہ اور اجازت بھی دیتے رہے۔ فوجِ مخالف سے نہ صرف محبّت و رافت کا برتاؤ کیا بلکہ اُن کو پند و نصیحت کرتے رہے تاکہ نہ جبر کا کوئی پہلو پیدا ہو اور نہ حقِّ تبلیغ ادا کرنے میں کوتاہی رہے۔ شبِ عاشورا شمع گُل کر کے اپنے ساتھیوں کو واپس چلے جانے اور اِس ضمن میں ہر طرح کی نفسیاتی احتیاط برتنے کا ذکر تو آپ بارہا سُن چکے ہیں۔ زرا محبّت و رافت کے اس منظر کو تو دیکھئے کہ جناب حُر کے پیاسے لشکر کا ایک سپاہی علی ابن طعانِ محاربی لشکرِ حُر میں سب سے آخر میں ہے اور پیاس سے اُس کے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں۔ وہ خود ناقل ہے کہ "امام حسینؑ نے میری یہ حالت دیکھی تو فرمایا" انخ الرّاویہ" میں اُن کا مطلب نہ سمجھ سکا کہ مشک کو بٹھانے سے امامؑ کی مراد کیا ہے۔ میری زبان میں تو راویہ مشک کو کہتے ہیں۔ جب امام نے پھر فرمایا "انخ الجمل" تو میں آپ کا مطلب سمجھا اور شتر آبکش کو بٹھا بھی لیا مگر اپنی بدحواسی کی وجہ سے پانی نہ پی سکا۔ پانی بہتا جاتا تھا اور میرے منھ میں ایک قطرہ بھی نہ پہونچتا تھا۔ امام نے میری یہ حالت دیکھی تو مشک کا دہانہ درست فرما کر مجھے پانی پلوایا۔" ان نیکیوں، احتیاطوں

اور اُن تقریروں سے جو امام حسینؑ نے فریقِ مخالف کے روبرو مختلف موقعوں پر فرمائیں صاف ظاہر کر دیا کہ حسینؑ کا مقصد خروج، لشکر کشی یا سلطنت کا حاصل کرنا نہ تھا۔ حالانکہ یزید لعین ایسے فاسق و فاجر کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کرنا خروج کی تعریف میں نہیں آتا۔ انھیں باتوں کا اثر تھا کہ ساتویں محرّم سے عاشورا تک جنابِ حُر کے علاوہ افواجِ یزیدی لعین میں سے کم از کم تیرہ حق پرست سپاہی امامؑ کی طرف آ گئے اور اُن کا یہ آنا بھی آپ کے حق پر ہونے کا کھلا ثبوت ہو گیا۔ بس اتنے ہی حق پرست تھے ورنہ لشکرِ یزید لعین کا رویّہ تو یہ تھا کہ شبیہِ رسولؐ مقبول جنابِ علی اکبرؑ کا احترام بھی کسی نے ملحوظ نہ رکھا۔ کاش وہ رسول کی تصویر ہی کو دیکھ کر اپنے ارادے سے باز آ جاتے، اسلام تو خیر دور کی بات تھی! جنابِ علی اصغرؑ کی شہادت سے تو یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ یزیدی لشکر جذباتِ انسانیت سے بالکل معرّا تھا۔ اِس شیر خوار کی قربانی محض گوشت و پوست کی قربانی نہ تھی۔ اللہ کی اطاعت اور عبودیتِ کامل کی نایاب مثال تھی۔ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا بہترین مظاہرہ تھا۔ اپنی متاعِ عزیز کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کا عدیم المثال اقدام تھا۔ یہ ماسوا اللہ سے بے نیازی اور اللہ کی محبت میں سرشاری اور اپنی خواہشوں، تمنّاؤں اور آرزوؤں کی قربانی کی وہ منزل تھی جہاں خود اپنی مرضی ہیچ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ بھی اُن شقی القلب لوگوں کو متاثر نہ کر سکی۔ اِس طرح ایک طرف تو حسینؑ پر خروج، سلطنت حاصل کرنے اور

غلبے کے الزام کا سدِّ باب ہوگیا اور دوسری جانب اُن کی انسانیت اور مخالف کی بہیمیت کا اظہار اِس عنوان سے ہوگیا جس سے دنیا سمجھ لے کہ یہ جنگ جاہ و منصب کے حاصل کرنے یا سلطنت و حکومت کے لئے نہ تھی بلکہ یہ اللہ کی خدائی منوانے اور انسان کی خدائی مٹوانے کے لئے تھی۔ یہ بہیمیت اور انسانیت کی جنگ تھی، حق و باطل کی جنگ تھی، ظالم و مظلوم کی جنگ تھی، اللہ کی ربوبیت اور یزیدؑ کی "ربوبیت" کی جنگ تھی اور اگر یہ جنگ جارحانہ اقدام کے طور پر ہوتی تو حضرت عباسؑ کو منزلِ اظہارِ شجاعت کے بجائے ضبطِ شجاعت کی دشوار راہ پر کیوں چلنا پڑتا۔ اب رہا اس جنگ میں بنی اُمیہ اور بنی ہاشم کی خاندانی دشمنی کا معاملہ تو اگر واقعاً جذبۂ دشمنی کارفرما ہوتا تو امام حسنؑ امیر معاویہ سے صلح کیوں کرتے۔ یا امام حسینؑ اِس صلح کے بعد دس سال تک خاموش کیوں بیٹھے رہتے۔ اور اگر بفرضِ محال ایسا گمان کیا بھی جا سکے تو اولادِ ابوطالبؑ کے شانہ بہ شانہ جناب زہیر ابن قین کے والہانہ اور سرفروشانہ اندازِ جہاد نے اِس کا بھی خاتمہ کر دیا۔

حضرتِ عثمان کے قتل کے بعد سے مسلمانوں کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک نے حضرت علیؑ کو خلیفہ مانا جو علوی کہلائے اور دوسرے نے امیر معاویہ کو خلیفہ بنایا اور یہ عثمانی کہلائے۔ جناب زہیر ابن قین عثمانی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے

مقابلے میں معاویہ کی طرف سے شریکِ جنگ بھی رہ چکے تھے۔ یہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ حج کو گئے تھے۔ واپسی میں امامؑ اور اِن کا ساتھ ہوگیا۔ مگر یہ اپنے خیمے امامؑ سے دور ہی دور نصب کراتے تھے۔ جب امام کوچ فرماتے تو یہ قیام کرلیتے تھے۔ اور وہ قیام فرماتے تو یہ چل کھڑے ہوتے تھے۔ ایک منزل پر حسنِ اتفاق سے دونوں ایک ہی مقام پر خیمہ زن ہوگئے۔ امامؑ نے اُنھیں بلوابھیجا۔ اُن کو امامؑ کے پاس جانے میں تامّل ہوا تو اُن کی زوجہ نے کہا "کیا خوب! فرزندِ رسول تم کو بلا بھیجے اور تم اُن سے ملاقات نہ کرو!" یہ گئے تو بہت خوش واپس آئے اور اپنے خیموں کو حسینؑ کے خیموں کی طرف منتقل کردیا۔ پھر تو آپ نے وہ وہ جانبازیاں دکھائیں اور ایسا جہاد فرمایا کہ بڑے بڑے سورما اِن کا لوہا مان گئے۔ جنابِ حُرؔ کے ساتھ مل کر جہاد فرمانے سے آپ نے یہ بھی ظاہر کردیا کہ حسینؑ کی حمایت میں قبیلے اور برادری کا فرق بھی حائل نہیں۔ اُن کی حمایت میں عثمانی گروہ کا سرآمدِ روزگار بھی ہے اور یزیدی فوج کا سپہ سالار بھی۔

غرض حسینؑ نے تحفظِ اسلام کی نازک اور اہم ذمہ داری کو ایسی مخصوص جُرأت وہمّت اور تدبّر و ہوشمندی سے ادا فرمایا کہ واقعۂ کربلا تاریخ کا ایک یادگار اور فقید النظیر واقعہ ہوگیا۔ اور تجدیدِ اسلام کا میدان اُسی طرح حسینؑ کے ہاتھ رہا جس طرح تبلیغِ اسلام کا سہرا رسول اللہؐ کے سر اور اگر وفاتِ رسولؐ تعلیمِ اسلام کا مقطع تھی تو شہادتِ حسینؑ

اصولِ اسلام کی تجدید کا نیا مطلع ہوگئی۔ یہ تھی حسینؑ کی حقیقی عظمت جس نے اُن کو بڑے بڑوں میں بھی ممتاز اور ابتدائے عالم سے قیامِ قیامت تک سرفراز کردیا۔

اِس جہاد میں ذوقِ قربانی کے اعتبار سے یوں تو سب ہی انصارِ حسین برابر کے شریک تھے لیکن جتنی فردیں خاندانِ ابو طالب کی اِس میں شریک ہوئیں کسی اور خاندان کی نہیں ہوئیں۔ اگر بہت دور نہ بڑھئے اور پشتوں آگے نہ جائیے اور پیڑھیوں کا حساب نہ لگائیے تو اس معرکۂ کربلا میں نسلِ بنی ہاشم سے اولاد ابو طالب ہی کی کارفرمائیاں اور جاں نثاریاں زیبِ عنوان ملیں گی۔

دو جعفر کے چراغ، پانچ علیؑ کے لال، تین حسنؑ کے فرزند، دو حسینؑ کے دلبند، پانچ عقیل کی آنکھوں کے نور!!

پھر آلِ ابو طالب میں سے خواتین نے بھی اپنے حدودِ عمل کے اندر اس معرکے میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ اور اس لحاظ سے اولادِ ابو طالب کی افضلیت اس خصوص میں اپنے آباء و اجداد سے بھی بڑھ گئی۔

اور یہ حسنِ اتفاق تو دیکھئے کہ اِن میں سے زیادہ تعداد فرزندانِ عقیل کی تھی۔ جن کا حصہ اسلام کی تاسیس میں نسبتۃً کم تھا۔ اور کثرتِ تعداد ہی پر منحصر نہیں۔ حمایتِ حق میں اُن کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ باوجود اس کے کہ اولادِ عقیل کے لئے مسلمؑ کی شہادت کو کافی

سمجھ کر شبِ عاشورا امام حسینؑ نے اُن کے فرزندوں کو چلے جانے کا مشورہ بھی دیا مگر اُنھوں نے متحد اللفظ ہو کر کہا کہ وہ امامؑ سے جُدا نہ ہوں گے، اُن کو تنہا نہ چھوڑیں گے، اپنی جانوں کو اُن سے عزیز نہ رکھیں گے۔ اور یہ حسینؑ کو چھوڑ کر جاتے بھی کیسے کہ یہ برجِ شرافت کے تابندہ ستارے اور شمعِ معرفت کے جانباز پروانے تھے۔ اولادِ عقیل ہی نہیں اولادِ ابوطالب میں سے جسے بھی دیکھئے ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا اور ایک ہی دُھن میں لگا ہوا تھا۔ یہ تمدّنِ انسانیّت کے گوہرِ آبدار، فانوسِ ایثار و خدمت کے انوار اور جذبۂ فداکاری میں فردِ روزگار تھے۔ مثال کے طور پر علی اکبرؑ و قاسمؑ اور عبداللہ و علی اصغرؑ کو لیجئے۔ یہ گویا ایک ہی تسبیحِ امامت کے دانے اور ایک ہی لیلائے حقّانیت کے دیوانے تھے۔ بطن کے لحاظ سے مختلف، نورِ صلب کے اعتبار سے بہ نصِّ رسولؐ ایک۔ لیکن اتنی یکسانی و ہم آہنگی کے باوجود بھی ایک دوسرے سے مختلف۔ ایک اٹھارہ برس[1] کا کڑیل جوان، ایک چودہ برس کا نوجوان۔ ایک دس گیارہ برس کا شیرِ بیشۂ حیدرِ کرّار اور ایک چھ ماہ کا شیر خوار۔ دو حسینؑ کے نورِ نگاہ جن میں سے ایک لیلیٰ کا فرزند، دوسرا رباب کا دلبند، دو حسنؑ کے لال، اُمّ فروہ کے مرکزِ اُمید۔ اعتبارِ قربانی کے لحاظ سے ایک مگر اندازِ قربانی کے اعتبار سے مختلف۔ ایک اِذن پانے کے لئے مضطرب، ایک اِذن نہ ملنے پر دل ملول۔ ایک جوشِ جہاد میں

---

[1] مشہور روایت کے مطابق۔

پھوپھی کا دامن چھوڑ کر میدان میں آتا ہے اور دوسرا ذوقِ قربانی میں اپنے کو جھولے سے گرا دیتا ہے اور باپ کے ہاتھوں میدان میں لایا جاتا ہے۔ ایک کے سینے میں برچھی در آئی، ایک کی لاش پارہ پارہ ہوئی۔ ایک نے پہلے تلوار ہاتھ پر کھائی اور پھر تیر کھایا، دوسرے نے پہلے تیر کھایا اور پھر مسکرایا۔ اگر ایک طرف قاسمؑ و عبداللہؑ نے باپ کی شجاعت کا مظہر بن کر حمایتِ حسینؑ میں مصلحتِ صلح و جنگ کے رازِ سربستہ کو منکشف کیا تو دوسری طرف علی اصغر نے مخالف کی بہیمیت کا پردہ اس طرح چاک کر دیا کہ مقصد کے اعتبار سے وہ صفِ شہدا میں سب سے آگے بڑھ گئے۔

غرض ان سب ہی نے اپنے اپنے عمل سے ابو طالبؑ کا بول بالا کیا، ان کی فوقیت کو مہرِ نیم روز بنایا اور جس طرح مدینے کے مباہلے میں اولادِ ابو طالب معین بنی اسی طرح کربلا کے مجاہدے میں اولادِ ابو طالب کی سعی اسلام کی سینہ سپر ہوئی۔

انھوں نے نصرانیوں کے دعووں کو جھٹلا کر اسلام کی صداقت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے نام نہاد مسلمانوں کی دراندازیوں کا مقابلہ کر کے الٰہی حاکمیت کا سکّہ دلوں پر بٹھایا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ وہ رسالت و عصمت اور امامت و صداقت کے حصار میں تھے اور یہ شرارت و شیطنت اور شقاوت و منافرت کے نرغے میں!!

اس گھرانے کی مخدراتِ عصمت نے بھی خیر و شر کے معرکوں میں

ضرورتِ وقت کے مطابق حصّہ لیا۔ کبھی جبر و تشدد کی منزل کو ضبط و خاموشی سے طے کیا اور کبھی دربارِ یزیدؑ میں گھن گرج خطبہ پڑھ کر اعلائے کلمۃ الحق فرمایا۔

حق پر اپنی جان اور اولاد کو قربان کر دینا، مصیبتوں میں نہ گھبرانا، ہمہ وقت راضی بہ رضا رہنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر حسینؑ کی ذات نہ صرف اِن دشوار منزلوں کے لئے نشانِ راہ بن گئی بلکہ اُنھوں نے کتاب و سُنّت کے قانون کو از سرِ نو رواج دے کر اور اسلام میں ملوکیّت و خود پرستی کی آمیزش کی بدعت کو رد کر کے اور حق کی حمایت میں زور و زر سے مرعوب نہ ہو کر ایسی مثال قائم کر دی جس کا تصوّر بھی آسان نہیں۔ اُنھوں نے انسان کے دل و دماغ میں ایک انقلاب پیدا کر کے عالمِ انسانیت کے لئے گویا ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنا دیا۔

اور یہ وہ کارنامہ ہے کہ

انسانیت ہے آج بھی منت کشِ حسینؑ
صدیاں اگرچہ گزر رہی ہیں احساں کئے ہوئے!!
(ثانی جائسی)

(۲)

حسینؑ کی کردار ساز شخصیت!!

کردار کے لغوی معنیٰ ہیں طرز، روش، عمل یا فعل۔ اصطلاحی معنوں میں یوں کہئے کہ جو طرز و طریقِ کار انسان اپنی روزمرہ زندگی میں برتتا یا اختیار کرتا ہے وہی اُس کا کردار ہوتا ہے۔

یہ طرز و روش باپ دادا سے وِرثے میں بھی ملتی ہے اور اپنے گرد و پیش کے رہنے والوں کے اثر، اُن سے ملنے جُلنے، اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور پڑھنے لکھنے سے بھی بنتی ہے۔ اِس طرح یہ طرز و روش گویا خلقی بھی ہوتی ہے اور اکتسابی بھی۔ اور اگر ماں باپ کو ایک درمیانی کڑی مان لیں تو پھر کردار نتیجہ ہوگا گزرے ہوؤں کے نقوشِ دوامی اور اپنے زمانے کے چلتے پھرتے لوگوں کے عارضی اثرات کے ایک سلسلے کا۔ اور اگر وراثت کو ماضی اور ماحول کو حال سے تعبیر کریں تو دونوں کا مناسب سہارا لے کر مستقبل کو سنوارنے یا بگاڑنے کی روِش گویا کردار ہوگی۔ اور یہ ایک مانی ہوئی حکیمانہ حقیقت ہے کہ وہ وراثت ہو یا ماحول انسانی سرشت پر اُس کے بُرے اثرات نسبتہً زیادہ مرتّب ہوتے ہیں اور انسانی فطرت اور طینت اُس کے کمزور پہلو زیادہ قبول کر لیتی ہے۔ یعنی عموماً ایسا ہی ہوتا ہے

کہ وراثت اور ماحول جتنا زیادہ ناقص ہوگا کردار بھی اُسی اعتبار سے ناقص ہوگا اور اِس کے برخلاف وراثت اور ماحول جتنا بلند ہوگا کردار بھی اُسی تناسب سے اعلیٰ درجے کا ہوگا۔ لیکن یاد رہے کہ وراثت اور ماحول کے اثرات کو بھی ریاض اور مشق، توجّہ اور فکر سے بڑی حدتک بدلا جاسکتا ہے اور انسانِ کامل وہی ہے جو وراثت اور ماحول کے مُضر اثرات کو دُور کرکے اپنے کردار کو پاک کرے اور ناپاکی و نجاست میں آلودہ نہ ہونے دے۔

مگر وراثت اور ماحول کے حُسن و قبح اور کمال و نقص کے معیار الگ الگ ہیں۔ مثلاً ایک خاین کے نزدیک جو معیارِ وراثت و ماحول قابلِ فخر ہوگا وہی ایک امین کے لئے باعثِ ننگ۔ اِسی طرح خطا کار کا معیار پارسا کے لئے، ڈاکو کا مزدورِ جفاکش کے لئے، جاہل کا عالم کے لئے، بخیل کا سخی کے لئے، کج خُلق کا خلیق کے لئے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اِسی طرح دُنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھنے والے کا معیارِ حسن و قبح اور نقطۂ کمالِ نفس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لینے والے کے معیار سے قطعاً الگ ہوگا اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے کہے گا

آنچہ در کردار فخرِ تست آں ننگِ منست!!

غرض وراثت اور ماحول یہ دونوں کردارِ انسانی کے سرچشمہ ہیں جو بلند بھی ہوسکتے ہیں اور پست بھی۔ اور ان میں سے ایک بلند اور دوسرا پست بھی ہوسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پستی اور بلندی

کس طرح ناپی جائے۔ کس قسم کے کردار کو پست کہا جائے اور کس کو بلند۔ لہٰذا یہ معلوم کرنے اور سمجھ لینے کے بعد کہ کردار ورثے اور ماحول دونوں سے متاثر ہوتا ہے اور بنتا ہے یہ دیکھنا ہوگا کہ کردار کو کون سی چیز بلند کر سکتی ہے۔ اگر وراثت اور ماحول "آخرت فراموش" ہے تو پھر ظلم و تعدّی، فریب و دغا، لوٹ مار جیسی پوشیدہ خواہشوں اور کوششوں کے لئے راستہ صاف ہو گیا اور کوئی روک ٹوک باقی نہ رہ گئی۔ لیکن اگر وراثت و ماحول "آخرت بین" ہے تو ناانصافی، حق کشی، زبردستی اور چیرہ دستی کے راستے بند ہو جائیں گے اور وہ کردار کار فرما ہوگا جو ہمہ وقت مرضیٔ الٰہی کے مطابق بروئے کار آسکے۔ اور یہی وہ منزلِ قرار اور جادۂ اعتدال ہے جو اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ کر عصمت کی حدوں میں داخل ہو جاتی ہے اور مرضیٔ معبود سے سرِ مُو متجاوز نہیں ہوتی۔ ائمۂ کرام اور انبیائے عظام کو معصوم کہنے سے ہماری مراد بس اِتنی ہی ہے کہ وہ مرضیٔ الٰہی سے کبھی تجاوز نہ کرتے تھے۔ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، اُن کا کھانا پینا، اُن کا بولنا چُپ رہنا، اُن کی زندگی اور موت غرض اُن کا ہر عمل یا فعل مرضیٔ الٰہی و منشائے خداوندی کے عین مطابق ہوتا ہے۔ یہ کہا جا چکا ہے کہ کردار وراثت اور ماحول دونوں ہی سے متاثر ہوتا ہے۔ اور گو فطرتِ انسانی عموماً ان کے بُرے اثرات ہی کو قبول کرتی ہے اور بیشتر یہی اثرات منتقل ہو کر جزوِ کردار بنتے ہیں۔ لیکن کردار کا معیار بھی حسن و قبح اور

کمال و نقص کے اعتبار سے اَدلتا بدلتا اور گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اور ماحول و وراثت کے اثرات کو بھی ریاض و مشق اور فکر و توجہ سے بڑی حد تک تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ انسانِ کامل وہی ہے جو وراثت اور ماحول کے بُرے اثرات کو دُور کر کے اپنے کردار کو پاک کر لے اور ناپاکی اور نجاست میں آلودہ نہ ہونے دے۔

اِس تمہید کو پیشِ نظر رکھ کر اگر آپ کسی کے بھی کردار کا جائزہ لیں تو اُس کے اِرثی امتیازات اور اُس کے ماحولی خصوصیات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد آپ کسی نتیجے تک تو ضرور پہونچ سکتے ہیں مگر جب تک آپ یہ بھی نہ جان لیں کہ اُس شخص نے وراثت اور ماحول کے اثر کو کس حد تک قبول کیا اور کہاں تک اُس کو رد کیا ہے۔ اُس کے کردار کے متعلق آپ کوئی صحیح رائے پھر بھی قائم نہیں کر سکتے۔ دراصل اِس ردّ و قبول کی جزئیوں اور نتیجوں ہی سے انسان جانا پہچانا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر جنابِ رسولِ خدا حضرتِ محمدِ مصطفٰےؐ کو لے لیجئے۔ مانا کہ آپ کا تو ارث بے عیب اور نورانی تھا مگر گھر سے باہر آپ کے گرد و پیش کا ماحول تو سراسر تاریک اور پُر از معصیت ہی تھا۔ مگر آپ کی فطرتِ کامل اور ضمیرِ پاک نے اُس خارجی ماحول کا اثر قبول نہ کیا بلکہ خود اُس ماحول ہی کو اپنے منشا کے مطابق بدل کر رکھ دیا۔ ماحول سے متاثر ہونا اگر لازمی ہوتا تو پھر ہمارے رسولؐ کو اپنے زمانے کے خارجی ماحول کے اعتبار سے خاکم بدہن، معاذ اللہ، سب سے بڑا کافر اور مشرک ہونا

چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہ ہونا اس بات کا ثبوت بن گیا کہ ابوطالبؑ کا بنایا ہوا جو گھریلو ماحول رسولؐ کا تھا وہ اِس قدر کامل، ایمان افروز اور رنگ میں چوکھا تھا کہ کوئی دوسرا خارجی ماحول اُسے ناقص بنا ہی نہ سکتا تھا۔ جہل و کفر کا اندھیرا اُس پر چھا ہی نہ سکتا تھا اور کوئی دوسرا بے تکا رنگ اُسے دبا ہی نہ سکتا تھا اور یہی بات حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ اور آپ کی اولادِ معصوم کے لئے بدرجۂ اتم صحیح و دُرست ہے۔

حسینؑ علیہ السّلام اور یزید علیہ اللعن کی مثال پر غور فرمائیے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں نے موروثی اثرات کو کس طرح قبول کیا اور ماحول کے اثرات کو کس حد تک ناقابلِ قبول سمجھ کر رد کر دیا۔

اگر باوا آدمؑ سے ابتدا نہ کیجئے اور ہزار ہا سال کا حساب نہ لگائیے تو جہاں تک اِن دونوں کے توارث کا سوال ہے ہم اپنی تحقیق و جستجو کو ہاشم اور امیہ سے بھی شروع کر سکتے ہیں کہ اُس سے قبل تو اِن دونوں کے خصوصیاتِ خاندانی بہرحال مشترک ہی تھے۔

اِدھر حسینؑ کے اب و جد موحّد، دیندار، مجاہد، سرفروش، خادمِ مخلوق اور عبدِ خالق۔ نانا وہ جس نے انسان کو انسان بنا دیا، دادا وہ جس نے رسولِ خدا کی پشت پناہی کی، دادی وہ جس نے تائید و تصدیقِ رسالت اُس وقت کی جب دُنیا رسولؐ کو جھٹلا رہی تھی۔ باپ وہ جس نے اسلام کی بگڑی بنائی۔ ماں وہ جو بقول مصطفےٰؐ

بضعۃ الرّسول - اُدھر یزید کے آباء و اجداد لشکرِ کفر و شرک کے سردار، بُت پرست، خود کام، خود کوش - دادا وہ جس نے رسولؐ کی مخالفت میں عمر گزاری - دادی وہ جس نے عمّ رسولؐ کا جگر چبایا - باپ وہ جس نے اسلام کی صورت بگاڑ کر رکھ دی اور ماں وہ جو بہیمیت و بربریت کی آغوش میں پلی بڑھی - مختصر یہ کہ اگر حسینؑ کا خاندان اپنی حق کوشی و بے نفسی کے لحاظ سے راہ نمائی کا حق دار تھا تو یزید کا خاندان اپنی خود کامی اور عیش پرستی کے اعتبار سے محض دنیا طلب - اور باطل کوش!!

حسینؑ نے آنکھ کھولی دینداری کی آغوش میں، ماحول دیکھا تو ذکرِ قرآن کا حُسنِ معاشرت اور فیاضی کا، سخاوت اور شجاعت کا، حق گوئی و حق نمائی کا۔ اس کے برخلاف یزید نے آنکھ کھولی تو جاہ و حشم کا وہ انداز دیکھا جس میں ربوبیّتِ ماسوی اللہ اور باطل پرستی ہی کا گزر تھا۔

حسینؑ کا ماحول جویائے حق کی رہبری کرتا تھا اور یزیدی ماحول دنیا کی سراب آسا چمک دمک کے فریب کا تماشا دکھاتا تھا۔ شبّیری ماحول میں حق پر جان دینا مقصدِ حیات تھا اور اُدھر دنیا پر جان دیتے رہنا ہی عینِ حیات!!

تاریخ شاہد ہے کہ حسینؑ کو بھی اپنی زندگی کے بیشتر حصّوں میں ایسے ہی دنیا دار ماحول سے سابقہ رہا - مگر کمالِ دانش و معرفت نے اُنھیں اُس سے شمہ برابر متاثر نہ کیا اور وہ اپنے گھرانے کے خدا پرست و مخلوق نواز ماحول ہی سے متاثر ہوئے جس میں قدرت نے اُنھیں

پیدا کیا تھا۔ قبولِ حق و ردِّ باطل کا یہی فطری اثر تھا جس کی قوت سے ماحول کے شدید مطالبوں کے باوجود اُنھوں نے اپنے ضمیر کے صحیح تقاضوں کو نظر انداز نہ کیا۔ اور نہ وہ اِس حقیقت کو بھولے کہ ظاہری نتائج سے بے نیاز ہو کر یزیدؔ سے مقابلے کا اقدام صرف ہلاکت اور ناکامی کو دعوت دینا ہے۔ لیکن تائیدِ حق ایک خدا پرست کا فریضۂ اوّلین ہے۔ حسینؑ حیات اور موت کی ماہیت کے شناسا تھے۔ وہ مرنے کے طور اور جینے کے انداز ہی نہ جانتے تھے بلکہ اِس راز سے بھی آگاہ تھے کہ دنیا گزشتنی و گزاشتنی ہے، باقی رہنے والی چیز بس ذاتِ باری ہے۔ اُسی کی پرستش اور اُسی کی رضا پر چل کر انسان بقائے دوام حاصل کر سکتا ہے۔ اُنھوں نے جب یہ دیکھا کہ جس بارگاہِ قدس کو اُن کے نانا نے اپنی ریاضتوں اور عبادتوں، مجاہدوں اور قربانیوں نیز اپنے اخوان و انصار کی سرفروشیوں اور جانبازیوں کے نقوش سے آراستہ کیا تھا اور جس کو مساوات و مواسات، حسنِ اخلاق و اخلاص اور ایثار و ہمدردی کے پھولوں سے سجایا تھا اور جو ہمہ وقت اللہ کی کبریائی کے غلغلوں سے معمور رہتا تھا اُس کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ ریاضتوں اور عبادتوں کی جگہ ناچ گانوں نے، مجاہدوں اور قربانیوں کی جگہ عیش پرستیوں اور ہوس رانیوں نے لے لی ہے۔ نفس پرستی اور سیاہ کاری نے حسنِ معاشرت کو یک لخت تباہ و برباد کر دیا ہے اور اللہ کی کبریائی کے بجائے بندے کی وہ فرماں روائی قائم ہو گئی ہے

جو انسانیت کے لئے پیامِ مرگ ہے تو اُن میں تابِ تحمل باقی نہ رہی اور
حسینؑ نانا کا دھڑکتا ہوا دل اور دماغ میں نانا کی تعلیم کا گہرا نقش لئے
ہوئے اِس تباہ کن صورتِ حال کے مٹا دینے پر تُل گئے۔ اُدھر اُس
سمیع و بصیر کی نگاہِ انتخاب نے بھی ساری کائنات میں حسینؑ کو، صرف
حسینؑ کو، اِس حالت کے بدل دینے کا اہل پایا۔ بس حسینؑ منتخب ہو گئے
اور کیسے نہ ہوتے

در مسلخِ عشق جُز نکو را نہ کُشند
لاغر صفتاں و زشت خو را نہ کُشند
گر عاشقِ صادقی، ز کشتن مگریز
مُردار بود آنکہ او را نہ کُشند

واقعہ یہ ہے کہ حسینؑ جیسے شیدائے حق اور عاشقِ جانباز نے
اِس انتخاب کی لاج رکھ لی۔ وہ عشق کے کیل گھر میں مردانہ وار داخل
ہو گئے۔ نہ سہمے، نہ جھجکے، نہ ڈرے، نہ گھبرائے، نہ بھاگے، نہ
کترائے۔ پھر اس مسلخِ عشق میں وہ اکیلے خود ہی داخل نہیں ہوئے۔
اپنے ساتھ کم سے کم بہتر سرفروشوں کو اور بھی لیتے گئے۔ ایسے ایسے
سرفروش جن کی مثال ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔ اور یہ سب کے سب
بھی بڑے تیکھے پن، بڑے بانکپن اور جانبازانہ تیور سے مسلخِ عشق
میں داخل ہوئے۔ اور ایسا جچا تُلا، سمجھا بوجھا قدم اُٹھایا کہ کسی
صاحبِ انصاف کے لئے نہ تو اپنے خلاف کسی غلط فہمی کا موقع
رہنے دیا اور نہ اپنے عمل پر حرف آنے دیا۔ حسینؑ نے تو
کردار والوں بلکہ کردار سازوں کی ایک ایسی جماعت کی جماعت

کھڑی کر دی جس کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔

حضرتِ مسلم کا موقع پا کر بھی اُمِّ ہانی کے گھر میں ابنِ زیاد کو قتل نہ کرنا اور جنابِ ضحاکِ مشرقی کا شریکِ جہاد ہو کر عاشورا کی دوپہر کے بعد حسبِ قرار داد کربلا سے چلا جانا کردار کے وہ نمونے ہیں جو شاید ہی کہیں اور نظر آ سکیں۔ اِن دونوں نے اپنے اپنے مقصد کے مقابلے میں کسی بات کی بھی پروا نہ کی۔ اُنھوں نے خود اپنی حفاظت کے امکان کی خاطر بھی ابن زیاد کو نہ مارا اور اِنھوں نے سعادتِ شہادت پر ادائے قرض کی اہمیت کو ترجیح دی۔ یہاں اور بہت سے ایسے ہی واقعات سے قطع نظر جو حسینؑ کی کردار سازی کے سلسلے میں یا کردار کو رفعت و سربلندی عطا کرنے کے معاملے میں پیش آئے محض شبِ عاشورا کے اُس عدیم المثال واقعے کو لیجئے جس کا تعلق محض شمع کے گُل کر دیے جانے اور اپنے اعوان و انصار کو اختیار بخشنے کے بعد اُسے دوبارہ روشن کر دئے جانے سے ہے۔

کیا تعجب جو روحانیّت اور فدائیت کی گفتگو میں کسی بعید ترین مادّی حجاب کے بھی حائل نہ ہونے کے خیال سے شمع گُل کر دی گئی ہو۔ بہر حال جب شمع روشن ہوئی تو با اختیار ناصروں پر جو نفسیاتی کیفیت طاری تھی وہ بس اتنی تھی کہ اپنی اپنی جانیں حسینؑ پر سے قربان کر دیں اور کسی نہ کسی طرح حسینؑ کو نرغۂ اعدا سے چھڑا لیں۔ انصار نے اپنی اِس نفسیاتی کیفیت کے پہلے جز کا اظہار تو اطمینانِ امام کے لئے

کر دیا۔ مگر دوسرے جز کا اظہار امامؑ کے سامنے کرنا سوء ادب سمجھے یا پھر اور کسی مصلحت سے مناسب نہ جانا۔ مگر خیال یہی ہوا کہ امامؑ قلتِ انصار سے نا اُمید ہو گئے ہیں اور اُن کو امید نہیں کہ جان بچ سکے گی۔ اِدھر حسینؑ کو یہ فکر تھی کہ اگر جان دینے کے بعد بھی اسلام کی جان نہ بچی تو یہ ساری قربانی بے سود ہو جائے گی۔ چنانچہ حسینؑ نے اپنے مقصد پر توجہ مرکوز کر دی اور انصارِ حسینؑ نے اپنے مرکز، اپنے امام کی طرف!! نتیجے میں اسلام کا پرچم سربلند اور ایثار و قربانی کا ایسا بول بالا ہوا کہ اُس کا جواب ہی نہ ہو سکا۔

حسینؑ کی اِس کردار ساز فطرت نے عالم میں ایک انقلاب پیدا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جو ابھی کل تک مُہر بر لب، پا بہ زنجیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے لبوں کی مہریں اور پاؤں کی کڑیاں توڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن میں حمایتِ حق کا ایسا حوصلہ اور ولولہ پیدا ہو گیا کہ جاں نثاری اور جاں سپاری اُن کے لئے گویا بازیچۂ اطفال بن گئی اور حق کوشی و حق نوازی اُن کا شعار ہو کر رہ گئی۔

اے حسین ابن علی، اے خسروِ گردوں رکاب
اے کہ تیری ذات خوبانِ جہاں میں انتخاب

(ماتی جائسی)

تیری قربانی سے باقی ہے جہاں میں نامِ حق
تو نے تلواروں کی دھاروں پر دیا پیغامِ حق!!

(۴)

خلافتِ یزیدؒ کے متعلق موقفِ حسینؑ کی صداقت وحقانیت!!

وہ امیر معاویہؓ جنھوں نے حضرت عمرؓ کی برہمی و ناپسندیدگی کے باوجود اپنے امیرانہ تزک و احتشام اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ اُسے بدستور باقی رکھا اور جو بقولِ خود دنیا میں پھیل پھیل کر رہے بھلا کیسے نہ چاہتے ہوں گے کہ اُن کا چہیتا اور اکلوتا بیٹا بھی رنگ رلیوں میں وقت نہ گزارے اور انھیں کی طرح عیش و آرام کی زندگی بسر نہ کرے۔ اور دنیا کے عیش و عشرت سے جی بھر کر فائدہ نہ اُٹھائے۔ اُن کی تو دلی آرزو ہو گی کہ یزیدؒ کی خلافت پر عامۃ المسلمین کی رضامندی کا کوئی قرینہ پیدا ہو جائے تاکہ وہ بخیالِ خود اطمینان سے سر پر خلافت چھوڑ سکیں لیکن عام مسلمانوں کے شدید جذباتِ مخالفت کے اندیشے سے دل کی بات زبان پر نہ لاتے تھے۔ حتٰی کہ اپنے محرمانِ راز کو بھی اُنھوں نے اس سے باخبر نہ کیا تھا۔ بہرحال وقت گزرتا رہا اور صلحِ حسنؑ کو تقریباً پانچ چھ سال بیت گئے۔ یہاں تک کہ امیر معاویہ نے مُغیرہ بن شعبہ کو

کوفے کی گورنری سے برطرف کیا تو اُس نے اپنی بحالی کے لئے یہ شگوفہ چھوڑا کہ یزیدؔ کے کانوں میں ولیعہدی کا افسوں پھونکا اور اُس کو یہ سبز باغ دکھایا کہ کوفے میں تو وہ خود عوام کو اُس کی ولیعہدی پر راضی کر لے گا، بصرے میں ابن زیاد اور مدینے میں مروان اُس کے لئے زمین ہموار کر لیں گے۔ رہ گیا شام، سو وہ تو اپنا ہے ہی۔

مُغیرہ کی اِن باتوں میں آکر یزیدؔ نے اپنے باپ سے اِس باب میں گفتگو کی تو مغیرہ کی یقین دہانی کے علاوہ گزشتہ تقریباً چالیسؔ سال میں جو قلبِ ماہیت عام مسلمانوں کی ذہنیتؔ میں ہو چکا تھا اور جس طرح اُن کی اکثریت امیر کے شاہانہ تزک و احتشام اور زر پاشی سے متاثر ہو چکی تھی اُس کی بنا پر اب امیر معاویہ کو خود بھی کامیابی کا ایک گونہ امکان نظر آنے لگا تھا۔

مغیرہ بدستور کوفے کا حاکم باقی رہا۔ زیاد اور مروان کو خلافتِ یزیدؔ پر عوام النّاس کو آمادہ کرنے کے لئے خطوط لکھے گئے۔ اور شام میں جو دوؔ خاص مخالف عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید اور سعید بن عثمان تھے اور جن کی آزاد رائے اِس ولیعہدی کے خلاف تھی اُن کو فریب اور لالچ دے کر راستہ صاف کر لیا گیا۔ عبدالرحمٰن بن خالد کو تو اُس کے معالج کے ذریعے سے زہر دلا کر ہلاک کر دیا گیا۔ اور سعید بن عثمان کو خراسان کی گورنری حوالے کر کے رام کر لیا گیا۔

اِدھر مُغیرہ نے مقصد برآری کے لئے خزانوں کے مُنہ کھول دئے۔

اور اپنی کارگزاری اور فرض کوشی کے اظہار کے لئے تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے بیٹے موسیٰ کی قیادت میں اہلِ کوفہ کا ایک 'زر خرید' وفد خلافتِ یزیدؔ کی حمایت میں مرتب کر کے امیر معاویہ کے پاس روانہ کر دیا!

اِس وفد سے ملاقات کے بعد امیر معاویہ کا موسیٰ بن مغیرہ سے یہ پوچھنا "سچ بتاؤ، تمھارے باپ نے اِن لوگوں کو اُن کے ایمان کی کیا قیمت ادا کی ہے" خلافتِ یزیدؔ کے متعلق گویا مجروح ضمیر کی آواز تھی - دوسری آواز اور آزاد رائے حاکمِ بصرہ زیاد کی تھی جس نے امیر کے اس اقدام کو نامناسب اور بے محل سمجھا - اور عبد بن کعب نمیری سے یہ تک کہا کہ" اسلام کا معاملہ اور اُس کی ذمّہ داری کا سوال بہت اہم ہے"۔ تیسری آواز مروان حاکم مدینہ کی تھی جس نے امیر معاویہ سے شام جا کر اِس ولیعہدی کے خلاف بالمشافہ گفتگو کی۔

اِس آواز کو، جو دراصل اپنے ذاتی مفاد پر مبنی تھی ضمیر کی آواز تو نہیں کہہ سکتے - مگر خلافتِ یزیدؔ کے عدمِ جواز کی حد تک یہ آواز بھی خاصی پر قوّت یا کم از کم گندم نمائی و جو فروشی کی مصداق تو تھی ہی - بہر حال معاویہ نے مروان کو یزید کے بعد خلیفہ ہونے کا یقین دلا کر مدینے واپس کر دیا - اور وہ اہلِ مدینہ کو خلافتِ یزیدؔ پر آمادہ کرنے اور خود یزیدؔ کا ولیعہد بننے کے لئے نئی نئی تدبیریں سوچنے میں مشغول ہو گیا - مدینے پہونچ کر مروان نے جو بزمِ مشاورت اعیانِ شہر کی منعقد کی اُس میں عبد الرحمٰن بن ابو بکر نے مروان کے منھ پر برملا کہہ دیا کہ" یہ تو قیصر و کسریٰ کا

طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اُس شرابی اور زانی کی بیعت نہ کریں گے۔" اور
عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیر اور حسینؑ ابن علیؑ نے اُن کی
تائید کی۔ لیکن اِس اظہارِ مخالفت اور انکارِ بیعت کے باوجود اعیانِ
حکومت اپنی سی کوشش یزیدؔ کی خلافت کی موافقت میں کرتے ہی
رہے۔ اور اُنھیں ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔
جب ۵۰ھ (مطابق ۶۷۰ء) میں مغیرہ کا انتقال ہوگیا اور ۵۳ھ
(مطابق ۶۷۲،۶۷۳ء) میں زیاد بھی مرگیا تو امیر معاویہؓ نے اِس مہم پر کمرِ ہمت
اور زیادہ مستعدی سے باندھ لی اور اتنا کام کرلیا کہ جب ۵۶ھء
(مطابق ۶۷۵ء و ۶۷۶ء) میں اُس نے یزیدؔ کی ولیعہدی کا اعلان کیا
تو بصرے اور کوفے سے تو بالاعلان کسی مخالفت کا اظہار ہوا ہی نہیں۔
مدینے کی اکثریت کو بھی لالچ اور خوف سے ہم خیال بنایا جا چکا تھا۔
اور اب وہی چند لوگ جو مروان کے اقدام کی مخالفت پہلے کر چکے تھے
اِس تحریک کے مخالف رہ گئے تھے۔ جن میں عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ،
عبداللہ بن عمرؓ اور حسینؑ بن علیؑ کے علاوہ رسول خداؐ کی بیوی جناب عائشہ
بنتِ ابوبکر اور بھتیجے عبداللہ ابن عباس نیز عبداللہ بن زبیر شامل
تھے۔ جنابِ عائشہ نے تو اِس مسئلے پر امیر معاویہ سے دو بدو بہت
تلخ اور سخت گفتگو کی اور جب وہ مدینے میں منبرِ رسولؐ پر بیٹھے یزیدؔ
کے لئے لوگوں سے بیعت لے رہے تھے تو حضرتِ عائشہ نے اپنے
حجرے سے پکار کر فرمایا۔" خاموش ہو جاؤ۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا تم سے

پہلے شیخین نے بھی اپنے بیٹوں کے لئے بیعت لی تھی "۔

ان مخالف حضرات کو پہلے تو دہشت زدہ کیا گیا۔ مگر جب اس سے کام نہ چلا تو پھر لالچ دی گئی۔ عبدالرحمٰن ابن ابوبکر کو ایک لاکھ درہم کی پیش کش کی گئی مگر وہ دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ عبداللہ ابن عمر کو بھی اتنی ہی رقم بھیجی گئی مگر انھوں نے جواب دیا کہ " اوّل تو میں مرنے کے قریب ہوں۔ پھر میرا ایمان ایک لاکھ درہم سے زیادہ قیمتی ہے "۔ امام حسینؑ کو بھی مال و دولت کے نذرانے پیش کئے گئے مگر وہ بھلا ان نذرانوں کو کیا قبول فرماتے ٹھکرا دیا۔ غرض تمام مخصوص مقتدر حضرات یزید کی خلافت کے عدم جواز پر ہم آہنگ تھے۔ اور اُن کو لالچ اور دباؤ سے قابو میں لانا بجائے خود خلافتِ یزید کے عدم جواز کی ایک بیّن دلیل تھی۔ جن اُمور نے سابق خلفاء کی اولاد اور مختلف نقطہائے نظر کے افراد کو خلافتِ یزید کے عدم جواز پر متفق کر دیا تھا وہ صرف یہی نہ تھے کہ اُس کی خلافت نہ تو منصوص من اللہ تھی نہ اجماعی بلکہ اُس کا قہر و غلبہ سے ہونا اور اُس کا خوف و دہشت سے بالجبر عاید کیا جانا بھی اُس کے عدم جواز کا کھلا ہوا ثبوت تھا۔ کیونکہ اب تک دستور یہ تھا کہ جو لوگ خلیفۂ وقت کی بیعت نہ کرتے تھے انھیں اِس پہ مجبور نہ کیا جاتا تھا۔ بہرحال اُن کی چند آوازیں تھیں جو اِس ناانصافی اور اسلام دشمنی کے خلاف سنائی پڑتی تھیں۔ اور ان میں سب سے زیادہ واضح، صاف، غیر مبہم

پُرقوت اور اپنے مخصوص امتیاز کے اعتبار سے سب سے زیادہ باوقار رائے حسینؑ کی تھی۔ اور سچ پوچھئے تو بس یہی ایک قابلِ لحاظ آواز تھی جو شدید مخالفتوں میں بھی آخر کار باقی رہ گئی تھی۔ مگر آپ نے بیعتِ یزیدؑ سے شدید کراہت اور اُس کے متعلق اپنی قوتِ انکار کے باوجود خود اپنی طرف سے نہ تو کھُلّم کھُلّا کسی مخالفت کا اظہار کیا اور نہ اُس کے بروئے کار لانے کے لئے کوئی خفیہ اقدام فرمایا۔ حتیٰ کہ وفاتِ معاویہ کے بعد جب آپ سے براہِ راست بیعت کا مطالبہ کیا گیا تب بھی آپ نے اپنی طرف سے پہل نہ کی تاکہ اُن پر جارحانہ اقدام کرنے کے الزام کا کوئی بعید از بعید امکان بھی پیدا نہ ہو۔ ہاں۔ خلافتِ یزیدؑ پر البتہ کسی قیمت پر رضامندی نہ دی اور اِس نارضامندی کو واضح کرنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

لیکن آخر وہ کون سا ایسا اہم موقف تھا جس کے لئے حسینؑ نے دل وجان اور متاع و مال سبھی کچھ قربان کر دیا اور اپنے جگر پاروں اور کلیجے کے ٹکڑوں تک کو مصائب اور موت کے سپرد کر دیا۔

آپ نے اہلِ کوفہ کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ "امام وہی ہے جو کتابِ خدا پر عامل، عدل گستری پر کاربند اور دینِ حق کا پابند ہو۔ اور اُس کا کوئی قول وعمل منشائے الٰہی کے خلاف نہ ہو"۔ آپ کی یہ تحریر آپ کے اصل موقف کی نوعیت اور خلافتِ یزیدؑ کی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ اور امامت کا یہی تصوّر آپ کے پیشِ نظر تھا جب آپ نے

یزیدؔ کی بیعت سے انکار فرمایا ابنِ اشعث کی اس بات پر کہ "اپنے ابنِ عم کی بیعت کیوں نہیں کر لیتے" آپ نے پُر غضب ہو کر ارشاد فرمایا۔ "یہ غلامی کی ذلت ہے جو، بخدا میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ ایسے سگِ دُنیا سے پناہ مانگتے تھے جس کا دماغ شاہانہ کرّوفر نے بحدِ دعوائے خدائی خراب کر دیا ہو۔ اور جو یہ سمجھتا ہو کہ اُسے اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہی نہیں ہے۔ یزیدؔ کے تکذیبِ وحی کرنے اور دینِ محمدیؐ کا استخفاف کرنے میں یہی تصورات مُضمر تھے اور یہی ذہنیت کار فرما تھی۔ حسینؑ کا جہاد اِسی ذہنیت کے خلاف ابطالِ باطل اور احقاقِ حق کے لئے تھا اور اُن کا موقف وہی تھا جو ان کے نانا محمد مصطفےٰ کا تھا۔ یعنی انسان اللہ کے سِوا کسی اور کا مطیع نہیں، کسی کا غلام نہیں، کسی کا بندہ نہیں، کسی کا فرماں بردار نہیں۔ ایک مسلمان اپنے دینی بھائیوں سے مروّت و رافت اور شرافت و انسانیت کا برتاؤ کرتا ہے تو محض اس لئے کہ اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اپنے وطن سے محبت کرتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کہ حُبِّ وطن کو جزوِ ایمان قرار دیا گیا ہے اور مخلوقِ عالم کے ساتھ مہربانی اور نرمی سے پیش آتا ہے یا اپنے اہل و عیال کی پرورش میں سعی کرتا ہے تو اِس وجہ سے کہ اللہ نے ایسا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ غرض اس کا ہر عمل اللہ کے حکم کا تابع ہوتا ہے۔ مگر وہ خود مرضی الٰہی کے خلاف کسی کا تابع نہیں۔

محمد مصطفےٰؐ نے انسان کو انسان کا مطیع سمجھنے اور بنانے کے عام رجحان کے خلاف ابولہب اور ابوجہل جیسے مصنوعی خداؤں سے محاربہ اور مجادلہ فرمایا تھا اور حسینؑ کا مجاہدہ اسی رجحان کے خلاف یزید لعین اور ابنِ زیاد ایسے خود ساختہ دیوتاؤں سے تھا۔ حسینؑ اِس فرض کی ادائی پر گویا مجبور تھے۔ خصوصاً جب سبھی خاموش ہو بیٹھے ہوں۔ یا خاموش کر دیے گئے ہوں۔ ایسی صورت میں تو یزیدؑ کے خلاف اُن کا کھڑا ہونا ایک فرضِ عین بن گیا تھا۔ پھر جب اُن کے سینے میں اپنے نانا کا دل دھڑک رہا تھا تو حسینؑ اپنے نانا کے دین کو مٹتے اور پامال ہوتے کیونکر دیکھ سکتے تھے۔ البتہ حسینؑ نے اپنے ضمیر کی آواز کو بلند کرنے اور اپنی آزاد رائے کو پیش کرنے میں احتجاج کا کچھ ایسا انوکھا انداز اور ایسا اچھوتا طرزِ عمل اختیار کیا کہ بیعت طلب کرنے کے حوصلے پسپا ہو گئے اور آپ کے بعد پھر کسی امام سے طلب بیعت کی جرأت نہ ہو سکی۔ اور آج اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اُن کے موقف کی صداقت و حقانیت جویائے وقوف کے لئے مشعلِ راہ بنی ہوئی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی رفعتِ منزلت اور اُن کے موقف کی صداقت و حقانیت عام لوگوں کے دلوں پر کالنقش فی الحجر ہوتی جاتی ہے۔ اُن کی محبت و عظمت روز بروز قلوبِ انسانی میں بڑھ رہی ہے۔ اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ حسینؑ کی جنگ حقانیت کا علم بلند کرنے اور انسانیت کا بول بالا کرنے کے لئے تھی۔ نہ کہ مُلک گیری کے لئے۔ اے خدا کے شیر کے شیر! اے ولی ابنِ ولی!!

اہلِ عالم کے لئے تیرا عمل درسِ خودی
جنگ میں تیری نہاں رازِ وقارِ آدمی!!

(ذمانی جائسی)

(۴)

حسینؑ کے سفرِ آخر کی قدر و قیمت!!

راحت کو راہِ دوست میں قرباں کئے ہوئے
جاتے ہیں شہ مدینے کو ویراں کئے ہوئے! (ماؔنی جائسی)

تو حسینؑ مدینے سے روانہ ہو گئے! یکشنبہ ۲۸ رجب سنہ ۶۰ھ (مطابق سنہ ۶۸۰ء) کی رات کو!! — یزید لعؔ کی جانب سے طلب بیعت کے فوراً بعد حسینؑ کی اس روانگی سے تو بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ اپنی موافقت میں زمین ہموار کر کے تخت و تاجِ خلافت پر قبضہ جمانے کو جا رہے ہوں۔ پھر تو رُخ دمشق کی جانب ہوگا۔ لشکر کشی کے لئے فوجیں ساتھ ہوں گی۔ مگر اُن کا رُخ تو شمال و مغرب کے بجائے جنوب و مشرق کی جانب ہے۔ اور اُن کے ساتھ بس چند با وفا غلام ہیں اور صرف اُن کے دادا ابوطالب کی اولاد۔ جن میں بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی شامل ہیں یعنی وہ دارالخلافت یزید کے بجائے دارالامنِ اسلام کی طرف جا رہے ہیں۔ دمشق نہیں مکّہ جا رہے ہیں اور اُن کے کسی انداز میں جارحانہ اقدام کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔

ہاں تو پانچویں ہی روز جمعہ کے دن ۳ شعبان سنہ ۶۰ھ (مطابق سنہ ۶۸۰ء) کو

حسینؑ مکّے پہنچ گئے اور شعبِ علیؑ میں قیام فرما ہو گئے۔

ہو سکتا ہے کہ ضیقِ وقت کے سبب سے ابھی لشکر جمع نہ کئے ہوں۔ عبداللہ ابن زُبیر مکّے میں پہلے سے موجود ہی ہیں اور اُن کو ایک حد تک مرجعیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ ممکن ہے اُن سے مشورہ کرنے کے بعد مکّے کے قیام میں باطمینان فوج جمع کر کے لشکر کشی کریں۔ لیکن باوجودیکہ لوگوں کا رُجحان اُن کی طرف بڑھ رہا ہے اور عبداللہ ابنِ زُبیر بھی مصلحۃً حاضر باش رہتے اور اپنی اسکیمیں اُن کو سُناتے رہتے ہیں مگر حسینؑ نہ تو اُن کے حوصلوں کی کوئی تائید کرتے ہیں اور نہ کسی قسم کی ہمت افزائی۔ نہ کسی سے کچھ کہتے ہیں اور نہ کسی کو یزید کے خلاف آمادہ کرنے کے لئے کوئی ریشہ دوانی کرتے ہیں ہمت افزائی کرنا تو درکنار آپ نے تو عبداللہ ابنِ زُبیر کی منصوبہ بندی پر یہ کہہ کر پانی ہی پھیر دیا کہ "اگر میں چیونٹی کے سوراخ میں بھی پہنچ جاؤں تو یہ مجھے وہاں بھی صحیح و سالم نہ رہنے دیں گے۔ مگر بخدا مجھے مکّے سے ایک بالشت باہر قتل ہونا زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں مکّے میں مارا جاؤں"۔

تو پھر آخر حسینؑ کی اِس سفر سے غرض کیا ہے۔ کیا حسینؑ اب بھی ویسی ہی خاموش زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جیسی اب تک بسر

کر رہے تھے ۔ یقیناً یہی چاہتے ہوں گے ۔ ورنہ مہینے بھر سے بھی زیادہ مدّت تک گوشہ گیر اور خاموش کیوں رہتے ۔ اور کیوں نہ کسی نہ کسی سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کرتے ۔ اور یہ بات پوری ذمہ داری سے کہی جا سکتی ہے کہ کوئی ضعیف سے ضعیف روایت اور خفیف سے خفیف بات بھی ایسی نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ حسینؑ نے کسی قسم کا کوئی اقدام اپنی طرف سے کیا ہو ۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ خود حسینؑ مدینے کے ہولناک ماحول کو چھوڑ کر مکّے چلے آنے کے علاوہ اپنی طرف سے اور کوئی عملی اقدام یزید کے خلاف کرنا ہی نہ چاہتے تھے ۔ اور جب دین کی حفاظت کے لئے کوئی مطالبہ کسی اور جانب سے تھا ہی نہیں تو پھر تحفّظِ دین کے لئے خطرات کے استقبال اور حفظِ جان کی شرعی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دینے کا کوئی محل بھی نہ تھا ۔ حسینؑ کا فریضہ تو یہ تھا کہ وہ تحفّظِ جان کی تدبیریں کریں اور بس ۔ اسی شرعی فریضے کی ادائی کے لئے وہ مکّے میں خاموش بیٹھے رہے ۔ ظاہر ہے کہ جب مذہبی جذبات فنا ہو چکے ہوں تو مادّی حالات سے مقابلے کا اقدام خودکشی کو دعوت دینے کے سوا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا ۔

مگر حسینؑ کی اس خاموش زندگی میں ایک تبدیلی ہوئی تو سہی ۔ وہی جب حسینؑ کے انکارِ بیعت اور مکّے کی ہجرت کا علم کوفے والوں کو

ہوا اور بعض خط حسینؑ کے نام اِس مضمون کے آئے کہ "ہماری سنئے اور ہماری دینی رہبری اور ہماری مذہبی صلاح و فلاح کے لئے جلد آئیے۔ ہماری بیچارگی پر رحم فرمائیے۔ آئیے، بہت جلد آئیے ورنہ ہم آپ کے جدّ سے شکوہ کریں گے"۔ یہ ایک خط نہ تھا۔ پے در پے اِسی لب و لہجے میں اِسی قسم کے مضامین پر مشتمل اِتنے خط آئے کہ دو تھیلے بھر گئے!!

سب سے پہلا خط بعض مخصوصین کا تھا۔ جو حسینؑ کو ۱۰ رمضان کو مل گیا تھا لہذا اب تو حسینؑ کو ضرور چلا جانا چاہیئے تھا خصوصًا جب بقیہ تمام خطوں کی رُوح وہی تھی جو پہلے خط کی تھی تو حسینؑ یقینًا کوفے کی جانب چلے جاتے مگر اُن خطوں میں ایسے خط بھی تو تھے جن میں مادّی کامرانیوں کے صریح اشارے بھی تھے اور جن سے مادّی جنگ کا اندیشہ بھی پیدا ہوتا تھا۔ مکّہ بہرحال دارالامن تھا۔ حسینؑ وہاں محفوظ تھے۔ حسینؑ کو مادّی فتوحات کا شوق ہوتا تو وہ فورًا چلے جاتے۔ مگر وہ نہ گئے۔ بلکہ آپ نے رسید کا خط لکھ کر اپنے چچازاد بھائی حضرت مُسلم ابنِ عقیل کو کوفیوں کے صحیح جذبات و احساسات کا بنفسِ نفیس اندازہ کرنے کے لئے کوفے روانہ کر دیا۔ آپ نے لکھا۔ "میں نے تمھارے خطوں کو غور سے پڑھا اور سمجھا۔ تم کہتے ہو تمھارے سروں پر کوئی امام نہیں ہے آپ آئیے تاکہ ہم حق پر مجتمع ہو سکیں اور امام سے مراد وہ ہے جو کتاب الٰہی پر

عامل سنّتِ رسول کا پیرو اور رضائے الٰہی کا تابع ہو۔ بہرحال میں اپنے بھائی کو بھیجتا ہوں تاکہ وہ تمھارے احساسات سے مجھے باخبر کریں۔ اگر اُنھوں نے تمھارے حق پر متّفق ہونے کی تصدیق کی تو عنقریب میں تمھاری طرف آتا ہوں"۔

کوفے سے مسلم کا اطمینان بخش خط حسینؑ کو مل گیا ہے۔ مگر حج کا زمانہ قریب آجانے کی وجہ سے حسینؑ کچھ دن اور مکّے میں قیام رکھنا چاہتے ہیں۔ البتہ حاجیوں کے بھیس میں حکومت کے فرستادہ سپاہیوں کی مکّے میں موجودگی چونکہ فتنہ و قتل کا پیش خیمہ تھی اس لئے احترامِ کعبہ کے خیال نے حسینؑ کو حج کئے بغیر ہی مکّہ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ بروزِ سہ شنبہ ۸ ذوی الحجّہ کو کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے اور حفظِ شریعت کے فرض اور ایفائے عہد کے لحاظ کا تقاضا بھی یہی تھا!!

لیجئے۔ اب حسینؑ کے سفر کی دوسری کڑی شروع ہو گئی جس کے سانحات و حادثات اور کیفیات و تاثرات نے اِس سفر کی نوعیّت و عظمت کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

اِس میں شک نہیں کہ اب تک حسینؑ کا طرزِ عمل قطعاً امن پسندانہ اور دین پرورانہ رہا۔ مگر اُن کے مکّے میں تقریباً تینؔ مہینے کے قیام کے

نتیجے میں از خود معتقدین کی ایک بڑی جماعت بن گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس اجتماع میں ایسے لوگ بھی ہوں جو اپنی خوش فہمی سے حسینؑ کے ساتھ رہنے میں مادی منفعت سمجھتے ہوں۔ لہذا حسینؑ نے مکے سے روانہ ہونے کے پہلے اِس اجتماع سے یوں خطاب کیا "بس اللہ ہی قدرت والا ہے۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اس کی ہر روز ایک نئی شان ہے۔ پھر موت تو مرد کے گلے کا ہار ہے۔ اور مجھے اپنے بزرگوں کی ملاقات کا اُتنا ہی اشتیاق ہے جتنا یعقوبؑ کو یوسفؑ کے دیدار کا تھا۔ میرے لئے تو ایک آرامگاہ منتخب کر لی گئی ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ صحرائی درندے نوادیس و کربلا کے درمیان میرے پوست سے استخوان جُدا کر رہے ہیں۔ مقدر میں جو ہے وہ تو ظاہر ہو کر ہی رہے گا۔ اور قلمِ قدرت نے جو لکھ دیا ہے وہ تو سامنے آ ہی جائے گا۔ ہم آزمایشوں سے گھبراتے نہیں۔ ہر حال میں راضی برضا رہتے ہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کو اجر دیتا ہے۔ بس تم میں سے جو رضائے الٰہی میں جان دینے پر آمادہ ہو وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے۔ میں کل صبح مکے سے روانہ ہو جاؤں گا۔" اس خطاب کے بعد اب کوئی ابہام نہ رہ گیا اور حسینؑ کا موقف اُجاگر ہو کر سامنے آ گیا۔ دوسری صبح ہوئی۔ حسینؑ مکے سے روانہ ہو گئے۔ وہی اولادِ ابوطالبؑ حسینؑ کے ساتھ رہ گئی جو مدینے سے محض تحفظِ جان کے خیال سے نکلی تھی اور اب تحفظِ ایمان کے فریضے کی ادائی پر کمر بستہ ہے۔ تیور بتاتے ہیں کہ کوئی قوت اُن کو اپنی راہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ جادۂ حق سے

منحرف نہیں کرسکتی - عزیزوں اور خیر سگالوں نے اُن کو روکنا چاہا - مگر یہ رُکے نہیں، بڑھے ہی چلے گئے - حتّٰی کہ حق کی منزل کے آخر تک پہنچ کر ہی دم لیا -

حسینؑ کے ابنِ عم یعنی جناب زینبؑ کے شوہر عبداللہ ابن جعفر نے اپنے بیٹوں، عون و محمد کو حسینؑ کے نام خط دے کر روانہ کیا جس میں لکھا تھا کہ "للہ! میرا خط پاتے ہی عراق کا ارادہ فسخ کیجئے - مجھے تو اِس سفر میں تباہی و بربادی کا سخت اندیشہ نظر آتا ہے، آپ کے لئے اور آپ کے اہلبیت کے لئے بھی - آپ نورِ خدا ہیں، اور مسلمانوں کے لئے منارۂ ہدایت - آپ نہ ہوں گے تو دنیا میں اندھیرا ہو جائے گا، اللہ کی نیکی باقی نہ رہے گی - خدارا! جلدی نہ کیجئے، توقّف فرمائیے - میں خود بھی آرہا ہوں" یہ خط بھیجا اور مدینے کے نئے حاکم کے بھائی یحییٰ بن سعید ابن العاص کو ساتھ لے کر حاکم مدینہ عمر ابن سعید سے حسینؑ کے لئے امان نامہ لکھوا کر ذات عرقؔ[1] کی منزل پر خود بھی پہنچ گئے - مگر حسینؑ اپنے ارادے پر مضبوط رہے - آپ نے فرمایا "اب میرا مزید قیام مناسب نہیں

---

[1] بعض روایتوں میں اُس منزل کا نام جہاں عبداللہ بن جعفر کی امام سے ملاقات ہوئی تھی "تنعیم" بھی لکھا ہے واللہ اعلم بالصواب ٥ اسی منزل پر عبداللہ ابن عباس اور ابوبکر بن حارث بنِ ہشام کی ملاقات بھی بیان کی جاتی ہے - واضح رہے کہ گو مختلف منزلوں کے ناموں اور وہاں کے پیش آمدہ واقعات کے بیانوں کے سلسلے میں روایتوں کا اختلاف ہے مگر نفسِ واقعات پر اُن اختلافات کا کوئی اثر نہیں پڑتا -

میں یہ سفر رسولؐ کے حکم کی تعمیل میں ایک امرِ خاص کی بجا آوری اور تکمیل کے لئے کر رہا ہوں جس کا اظہار میں مرتے دم تک کسی سے نہ کروں گا۔" عبداللہ یہ جواب سُن کر چپ ہو رہے۔ امان نامے کی حقیقت اور مکّے کی صورتِ حال دونوں سے بخوبی واقف ہوتے ہوئے اپنے سفر کو فسخ کر دینا تو تحفظِ جان اور تحفظِ ایمان دونوں فریضوں کی ادائی سے گریز کرنے کے مرادف ہوتا۔

یہیں شاعرِ دربارِ رسالت فرزدق سے بھی حسینؑ کی ملاقات ہوئی۔ اُس نے پوچھا "فرزندِ رسولؐ۔ آپ بغیر حج کئے جا رہے ہیں؟" آپ نے فرمایا۔ قیام کرتا تو گرفتار کر لیا جاتا۔" فرزدق نے عرض کی "کوفے نہ جائیے۔ کوفیوں کے دل آپ کے ساتھ ضرور ہیں مگر اُن کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔" لیکن مدینے اور مکّے کے حالات دیکھتے ہوئے حسینؑ کوفے نہ جاتے تو آخر کہاں جاتے۔ پھر ایفائے عہد بھی تو لازم تھا۔

امام نے اگلی منزل بطن الرمہ[1] میں کی اور یہاں سے مُسہر بن قیس صیداوی (بروایتے) اپنے برادر رضاعی عبداللہ بن یقطر) کو اہل کوفہ کے نام ایک خط اس مضمون کا دے کر روانہ کیا۔ "مسلم بن عقیل کے خط سے تمھارے حالات معلوم ہوئے۔ مطلع ہو کر میں کوفے کے لئے چل کھڑا ہوا ہوں۔"

آگے چل کر امام نے منزلِ زرود (خزیمیہ) پر قیام فرمایا۔ اور یہاں

---

[1] بروایتے اِس منزل پر عبداللہ ابن مطیع ملے اور امام کو کوفے جانے سے منع کیا۔

عثمانی گروہ کے سرآمد زہیر ابن قین کی امام سے ملاقات ہوئی۔ اِسی منزل پر دو اسدی عبداللہ ابن مسلم اور منذر ابن مشمل بھی فریضۂ حج سے فارغ ہو کر بھاگم بھاگ امام سے آ کر ملے اور آپ کی ہمراہی اختیار کی۔ اِس منزل پر امامؑ نے ایک سوار کوفے سے آتا ہوا دیکھا۔ چاہتے تھے کہ اُس سے کوفے کا حال معلوم کریں مگر حسینی قافلے کو دیکھ کر اُس نے راستہ بدل دیا۔ امامؑ کا منشا سمجھ کر اُن دونوں نو واردوں نے مشورہ کیا کہ چلو اس شخص سے کوفے کا حال تو دریافت کریں۔ ان لوگوں نے اپنے اونٹوں کو اُس کے پیچھے دوڑایا اور آخر کار اُس کو پا لیا۔ دریافتِ حال پر اُس اعرابی نے جو خود بھی اسدی تھا اُن اسدیوں کو حضرتِ مُسلم اور حضرتِ اُمِّ ہانی کے قتل اور اُن کی لاشوں کی تشہیر کی اطلاع دی۔

یہ دونوں اسدی اگلے روز منزلِ زبالہ پر امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُس اسدی مسافر کے حوالے سے اِن حادثوں کی اطلاع دی اور عرض کی کہ "اب آپ کا یہاں سے آگے بڑھنا قرینِ مصلحت نہیں۔ مناسبِ حال یہی ہے کہ آپ واپس ہو جائیں"۔

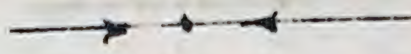
حالانکہ حسینؑ کے لیئے زمین تنگ ہو گئی تھی اور مدینہ و مکّہ دونوں مقاموں پر خطرات لاحق تھے مگر کوفے میں ضیاعِ جان کا جو کھلا ہوا خطرہ پیشِ نظر تھا اُس کی بنا پر آگے بڑھنا اب کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اور

پلٹ جانا یا کسی اور طرف چلا جانا عینِ مصلحت۔ تو کیا حسینؑ پلٹ جائینگے۔ اولادِ عقیل کے ایماء کے خلاف اور اُن کے جذبات و احساسات کو روند کر ایسے محل پر اپنے جگر کے ٹکڑوں اور فدائیوں کو تنہا چھوڑ کر بھلا حسین کیا جاتے! خطرات چاہے کتنے ہی شدید ہوں اولادِ عقیل کے دلی تلاطم کا لحاظ بھی تو بہر حال ضروری تھا!!

اِسی وجہ سے امامؑ نے اسدیوں کو کوئی جواب نہ دیا اور اولادِ عقیل سے فرمایا "مسلم تو قتل کر دئے گئے، تمھارا کیا ارادہ ہے۔" اُنھوں نے جواب دیا "ہم تو مسلم کے خون کا بدلہ لئے بغیر پلٹتے نہیں۔" یہ جواب سُن کر امامؑ نے فرمایا۔ "جب یہی (اولادِ عقیل) نہیں تو پھر ہم جی کے کیا کریں گے" اور اعلانِ عام کر دیا کہ "جو تیروں اور تلواروں کی باڑھ کو جھیل سکے اور مصائب کی آنچ برداشت کر سکے بس وہ تو ہمارے ساتھ رہے اور جو ایسا نہ کر سکے وہ چلا جائے۔ میری طرف سے اُس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔"

اگلی منزل بطنِ عقیق پر آپ کو قبیلۂ بنی عکرمہ کے ایک شخص سے قادسیہ اور عذیب (عذیب الهجانات) کی ناکا بندی اور اپنے رضاعی بھائی عبد اللہ ابن یقطر کی شہادت کی خبر بھی مل گئی۔ اِس شخص نے بھی آپ سے پلٹ جانے کو کہا اور بتایا کہ "جن لوگوں نے آپ کو خط لکھے وہی اب آپ سے مقابلہ کرنے اور لڑنے پر آمادہ ہیں۔" امامؑ نے اس

شخص کو دعائے خیر دی اور دو صبر آزما اور زہرہ گداز منزلوں کو طے کرنے کے بعد منزلِ سراۃ تک پہونچ گئے۔ یہاں آپ نے پانی ذخیرہ کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اب ذوالحجہ کی آخری تاریخ ختم ہو کر محرّم کی پہلی تاریخ آگئی تھی۔



ابھی حسینؑ کا قافلہ منزلِ شراف سے بڑھا ہی تھا کہ دوپہر کے وقت آپ کے ساتھیوں میں سے کسی نے "اَللّٰہُ اَکبَر" کہا بعض اصحاب نے یہ نعرۂ تکبیر اِس تصوّر کی بنا پر بلند کیا تھا کہ اُن کو خرمے کے درخت دکھائی دیے تھے۔ مگر اسدیوں نے اِس خیال کی رَدّ کی اور کہا "ہم کو تو گھوڑوں کے کان اور نیزوں کی انیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ خرمے کے درختوں کا تو یہاں دُور دُور کہیں نام نشان بھی نہیں"۔ امامؑ نے بھی یہی خیال ظاہر فرمایا۔ اور دریافت کیا۔ "یہاں کوئی ایسا مقام بھی ہے جہاں ہم چاروں طرف سے گھِر جانے سے محفوظ رہ سکیں"، کسی نے بتایا "بائیں طرف ذُو حُسَمؑ کی پہاڑی ہے۔ اگر اِس لشکر کے آنے سے پہلے ہم لوگ وہاں پہنچ جائیں تو تین طرف پہاڑ سے حفاظت ہو سکے گی۔ امامؑ نے اپنے ساتھیوں کو اُسی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔ اور قبل اِس کے کہ آنے والا لشکر وہاں پہنچے آپ کا قافلہ اُس پہاڑی تک پہنچ گیا۔ آنے والے لشکر نے حسینی قافلے کا رُخ بدلتے دیکھا تو گھوڑوں کو اور تیز کر دیا اور جب وہ ذُو حُسَمؑ کی پہاڑی تک پہنچے تو پیاس سے اُن کے ہوش بجا نہ تھے۔ یہ حُرؑ ابن یزید ریاحی کا

لشکر تھا۔ امامؑ نے خود اپنے انتظام اور نگرانی میں سارے لشکر کو مع اُن کے گھوڑوں کے پانی پلوایا۔ اب نماز ظہر کا وقت آگیا تھا۔ حجاج بن مسروق جعفی نے اذان کہی اور امامؑ کی اقتدا میں حسینی جماعت کے ساتھ ساتھ حُر کے لشکر نے بھی نماز ادا کی۔

حُر کے آنے تک حسینؑ کو یا تو دارالامن کی تلاش تھی یا رہنمائی حق کے لئے آمادگی اور مسلم اور عبداللہ ابن یقطر کی شہادت کی خبر پانے کے بعد شرافتِ نفس کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا تھا۔ اِس لئے وہ اُن خطرات کا مقابلہ کرنے پر بھی مستعد نظر آتے ہیں جن کا موخرالذکر دونوں صورتوں میں پیش آنا لازم تھا مگر اب صورتِ حال اور نوعیتِ واقعہ بدل چکی تھی۔ اب خطروں کا نہ صرف امکان تھا بلکہ خطرات نظر کے سامنے تھے اور یزید لعین کے نمایندے کا دوبدو مقابلہ تھا۔ اِس لئے امام نے اپنے موقف کا اظہار فرمانے کے لئے خطبہ ارشاد کیا۔ "اے لوگو! میں تمھارے پاس تمھارے خطوں اور التجاؤں کے بعد آیا ہوں۔ تمھارے بلانے پر آیا ہوں۔ تم نے لکھا تھا کہ آپ آئیے۔ ہمارے سروں پر کوئی امام نہیں ہے۔ شاید آپ کے ذریعے اللہ ہماری ہدایت کرے، اور ہم کو حق پر مجتمع کر دے۔ اب اگر تم میرے آنے کو اچھا نہیں سمجھتے تو میں اُسی راہ پر پلٹ جاؤں جدھر سے آیا ہوں۔" یہ پلٹ جانے کا ارادہ بظاہر پہلے ارادۂ سفر سے متناقص معلوم ہوتا ہے لیکن یہیں سے سلسلۂ اتمامِ حجت بالمشافہ شروع

ہو جاتا ہے۔

اِس خطبے کا کوئی جواب حُرؔ کے لشکر کی طرف سے نہیں دیا گیا اور فریقین متفرق ہو کر اپنی اپنی قیامگاہوں پر چلے گئے۔

نمازِ عصر کے بعد امامؑ نے ایک اور خطبہ ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو! اللہ سے ڈرو۔ اگر تم یہ سمجھ لو کہ حق اس کے اہل ہی کے لئے ہوتا ہے تو تمھاری بات اللہ کو بہت پسند ہوگی۔"

"در اصل ہم جماعتِ اسلامیہ کی رہنمائی کے لئے اُن سے زیادہ مستحق ہیں جو اُس کے مدّعی ہیں اور مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں لیکن اگر تم ہمارے حق کے قائل نہیں ہو اور ہم کو پسند نہیں کرتے۔ تمھاری رائے بدل گئی ہے اور تم اپنی تحریروں اور قاصدوں کے بیانات پر قائم نہیں ہو تو میں واپس چلا جاؤں۔" اور اس طرح مکرّر اپنے موقف کا صاف صاف اظہار و اعلان کر دیا۔

امامؑ کے دوسرے خطبے کے بعد حُرؔ نے کہا "یہ آپ کن خطوں اور قاصدوں کا ذکر فرما رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو تو اُس کی کوئی خبر ہے نہیں ہم میں سے نہ تو کسی نے آپ کو خط لکھے ہیں نہ آپ کے پاس قاصد بھیجے ہیں۔"

امامؑ نے عقبہ بن سمعان کو حکم دیا "جاؤ خطوں کے تھیلے تو لے آؤ۔"

امامؑ نے اُن خطوں کو حُرؔ کے سامنے پھیلا دیا۔ حُرؔ نے کہا "یہ خط

ہم لوگوں کے تو ہیں نہیں۔ ہم تو صرف آپ کو ابنِ زیاد تک پہنچا دینے پر متعین ہیں"۔ امامؑ نے فرمایا "تو پھر تمھاری موت تمھارے سروں پر کھیلتی نظر آئے گی۔

زرا اِس محل پر حسینؑ کا یہ احترامِ شریعت تو ملاحظہ ہو کہ اب تک تو آپ جائے امن کی تلاش اور فریضۂ دینی کے اجراء، اور اولادِ عقیل کے جذباتِ انتقام کے احترام کی بنیاد پر بڑھے جا رہے تھے۔ مگر اب فساد اور آویزش کے صریحی امکان کو ختم کرنے کے لئے واپس چلے جانے پر بھی راضی ہیں۔ اِس محل پر آپ نے انصار کے سامنے یہ تقریر فرمائی۔ "ساری صورتِ حال تمھارے پیشِ نظر ہے۔ دیکھو تو سہی زمانے کا رنگ کیسا بدل گیا ہے اور نیکیاں کس طرح ختم ہو گئی ہیں۔ نہ حق پر عمل ہوتا ہے، نہ باطل سے گریز۔ ایسے میں مومن تو بس اللہ کے قرب اور موت کا خواہشمند ہوتا ہے کہ مرنے میں شہادت کی نعمت نصیب ہوتی ہے اور زندہ رہنے میں ذلّت و اہانت"۔

اِس تقریر کے بعد جناب زہیر ابن قین کھڑے ہو گئے اور ساتھیوں سے دریافت کیا کہ آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں یا میں کچھ عرض کروں۔ سب نے کہا تم ہی کہو۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔
"اے فرزندِ رسول۔ اگر ہم کو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے کا بھی یقین ہو تو بھی ہم آپ کے ساتھ مرجانے کو ترجیح دیں گے"۔

نافع ابنِ ہلال نے کہا "فرزندِ رسول! نہ توآپ کے نانا سب کے دلوں میں اپنی محبت کا نقش بٹھا سکے اور سب کو اپنی اطاعت پر حسبِ منشاء آمادہ کر سکے۔ اور نہ آپ ہی اس باب میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جو مرحلہ آپ کے والد بزرگوار کو پیش آیا وہی آج آپ کو بھی درپیش ہے۔ لہذا جو اپنے عہد و پیمان پر قائم نہ رہے گا وہ خود ہی بھگتے گا اور پیشِ خدا جوابدہ ہوگا۔ خدا کا نام لے کر نیکی اور سلامتی کے ساتھ ہم کو خواہ مغرب کی طرف لے چلیئے یا مشرق کی جانب۔ ہم خدا کے معین کیئے ہوئے فیصلے سے ڈرتے نہیں۔ اور نہ اپنے خدا کے پاس پہنچ جانے سے کراہت کرتے ہیں۔ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں۔ آپ کے دوست کے دوست اور آپ کے دشمن کے دشمن ہیں۔" اس کے بعد بُریر ابن خضیر ہمدانی نے کہا۔ "فرزندِ رسول! اللہ کا یہ احسان اور اس کی یہ مکرمت کیا کم ہے کہ ہم آپ کے ساتھ جہاد کریں اور آپ کی نصرت میں اپنی جان دیں۔"

اب دوسرا مرحلہ اتمامِ حجت کا دیکھئے یعنی اس گفتگو کے بعد امامؑ نے اصحاب کو جس راستے سے آپ آئے تھے اُسی راستے پر پلٹ جانے کا حکم دے دیا۔ لیکن حُرؑ کی سپاہ سدِّ راہ ہوئی اور آخر کار بڑے حیلہ و حجت اور ردّوقدح کے بعد یہ طے پایا کہ نہ تو امام پلٹ کر مدینے جائیں اور نہ کوفے کی راہ پر چلیں۔ بلکہ ایک تیسرا ہی راستہ اختیار کریں جو نہ مدینے جاتا ہو

نہ کوفے ۔ راستے میں حُر نے بھی امامؑ سے کہا " خدا کے لئے اپنی زندگی پر رحم کیجیے ۔ کیونکہ اگر آپ نے جنگ کی تو بڑی تباہی کا سامنا ہو گا "۔

اس پر امامؑ نے فرمایا ۔ " تم مجھے موت سے ڈراتے ہو ۔ تم اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو ۔ لیکن یاد رکھو ایسے جوانمرد کے لئے جو راہِ حق پر اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ گامزن ہو مر جانا عین سعادت ہے "۔

اِس کے بعد کی منزلِ بیضہ پر امامؑ نے اپنے ساتھیوں اور حُر کے سپاہیوں دونوں کے سامنے ایک اور خطبہ فرمایا ۔ جس سے آپ کا موقف اور بھی واضح ہو جاتا ہے اور آپ کے اِس سفر کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے ۔ کُھلّم کُھلّا بڑھ جاتی ہے ۔

" اے لوگو ! جو کسی ایسے بادشاہ کو دیکھے جو ظلم کرتا ہو ، جس نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر رکھا ہو ، الٰہی عہد و پیمان کو توڑ دیا ہو ، اور سنتِ رسولؐ اور کتاب اللہ کا مذاق اُڑاتا ہو لیکن وہ اِن بے عنوانیوں کو انگیز کرے اور اصلاح کی کوئی سعی نہ کرے تو وہ بھی اسی ضمن میں محسوب ہو گا "۔

" تم کو معلوم ہے کہ بنی اُمیّہ نے شیطان کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال رکھا ہے اور اطاعتِ الٰہی سے منحرف ہو گئے ہیں مسلمانوں کے مال کو اپنے لئے جائز اور حرام کو حلال کر رکھا ہے ۔ لہذا مجھ سے زیادہ کس کو حق ہے کہ اِس صورتِ حال کے خلاف اصلاح کی کوشش کرے "!

اس کے بعد عُذیب الہجانات کی منزل سے کوفے کی راہ چھوڑ کر قصرِ بنی مقاتل سے بس کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ امامؑ پر ذرا غنودگی طاری ہوگئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو زبان پر کلمۂ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ جاری تھا۔ پے در پے اِن کلمات کو سُن کر حضرت علی اکبرؑ گھوڑا دوڑا کر آپ کے پاس پہنچے اور اِن کلمات کے ارشاد فرمانے کا سبب دریافت کیا۔ امامؑ نے فرمایا "میں نے ابھی ایک سوار کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ سفر کر رہے ہیں اور موت اُن کی گھات میں ہے"۔ شاہزادے نے پوچھا "کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" امام نے فرمایا۔ "جانِ پدر! بیشک ہم حق پر ہیں"۔ "تو پھر ہم کو موت کا کیا ڈر" شہزادے نے جواب دیا۔

منزلیں کھنچتی رہیں۔ اور حسینی قافلہ منزل بہ منزل بلا کسی روک ٹوک کے چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ارضِ نینویٰ پر وارد ہوا ہے۔ یہاں حُر کو ایک مسلّح سوار نے ابن زیاد کا خط دیا جس میں لکھا تھا "جہاں بھی یہ خط تم کو ملے۔ خبردار وہیں حسینؑ کو روک لینا اور اُن کو اِس پر مجبور کرنا کہ بے آب و گیاہ زمین پر قیام کریں"۔ امامؑ نے ذرا اور آگے بڑھ کر غاضریّہ یا شُفیہ میں ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر حُر نے معذوری ظاہر کی۔ لہذا حسینؑ بس تھوڑی ہی دُور بڑھ کر منزلِ کرب و بلا میں اُتر پڑے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

لیجئے حسینؑ کا سفر ختم ہوگیا۔ مگر انھوں نے جرأت و ہمت، عزم و ثبات، تدبّر و ہوشمندی، پامردی و باحواسی، صدق وصفا اور صبر و رضا کے جو نقوش اس راہ پر قائم کر دئے تھے اور ایثار و قربانی، حق گوئی و حق شناسی، احساس دینی و غیرتِ ایمانی اور خلوص و وفا کے جو خط بنا دئے تھے وہ اب تک باقی ہیں اور باقی رہیں گے حسینؑ کے اس سفر کی قدر و قیمت کا ایک ہلکا سا اندازہ بس اس سے کر لیجئے کہ انھوں نے اپنے اس آخری سفر کی صبر آزما اور زہرہ گداز منزلوں کو ایسے تیکھے طور، نرالے تیور اور اچھوتے انداز سے طے فرمایا اور نوعیت و کیفیتِ تاثرات و مؤثرات کے لحاظ سے اس سفر کو وہ امتیازِ خصوصی اور اعتبارِ کامل عطا فرما دیا کہ رہروئے عشق میں یہ سفر ایک نقطۂ آخر بن گیا۔ کسی اور راہبر کی ضرورت ہی نہ رہ گئی۔ اور ضرورت باقی رہ کیونکر جاتی وہاں تو

ہاتھ ڈالا نہ کبھی کوششِ لاحاصل میں

جو قدم اٹھتا تھا اٹھتا تھا حدِ منزل میں!!

(زائر سیتاپوری)

(۵)

مختصر حالاتِ حضرتِ عباسؑ و جنابِ زینبؑ!!

اے سوگوارانِ دردمان مرتضوی اور اے ماتمیان بزمِ حسینی! ان دو عظیم المرتبت شخصیتوں کے مختصر حالاتِ زندگی کا بیان مجھ سے متعلق کیا گیا ہے اُن کے لئے طویل سے طویل مُدّت بھی کسی نہ کسی حد تک مختصر ہی ہو گی خصوصاً جب حالات کے ساتھ حادثات و جذبات بھی شدّت کے ساتھ اِس طرح ملے جُلے ہوں کہ اُن کو الگ کر کے بیان کرنا گویا ممکن ہی نہ ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس دشوار گزار منزل سے مقررہ مدّت کے اندر کیوں کر گزرا جائے۔ صُدیوں کے حالات لمحوں میں بیان کرنے کی کون سی سبیل نکالی جائے اور اِس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کون سی صورت اختیار کی جائے۔ بس یہی ہو سکتا ہے کہ تفصیل کے بجائے اشاروں پر اکتفا کی جائے، "تاثرات کو آپ کے قلبِ صمیم کے حوالے کیا جائے اور نتائج کو آپ کے تخیلِ عظیم پر چھوڑ دیا جائے۔

حضرتِ ابوالفضل العبّاس، امامِ مظلوم سردارِ جوانانِ بہشت، کشتۂ دشتِ نینوا، اسیرِ رنج و بلا سیدنا و مولانا امام حسینؑ کے مختلف البطن بھائی اور امیر المومنین حضرت علیؑ کے بیٹے تھے۔ آپ کی والدہ گرامی کا نامِ نامی فاطمہ کلابیہ اور کُنیت اُمّ البنین تھی۔

سنہ ۲۶ھ (مطابق سنہ ۶۴۶ء) میں بمقام مدینۂ منوّرہ آپ پیدا ہوئے اور رجب سنہ ۶۱ھ (مطابق سنہ ۶۸۰ء) میں درجۂ شہادت نصیب ہوا تو آپ ۳۴ سال کے تھے۔ تاریخِ ولادت باختلافِ روایات ۱۳ / رجب ۱۸ / رجب اور ۴ / شعبان بتائی جاتی ہے۔ آپ کے تین بھائی تھے۔ عبداللہ، عثمان اور جعفر۔ اِن تینوں کو حضرتِ عبّاسؑ نے نہ صرف اپنے سامنے دشتِ کربلا میں شہید ہوتے دیکھا بلکہ جب تک یہ بہادر لڑتے رہے آپ یہ کہہ کر اُن کے حوصلۂ جانبازی کو بڑھاتے رہے "بڑھو، اور بڑھو۔ دھنسو، فوجوں میں اور دھنسو۔ تمھارے تو بیوی بچّے بھی نہیں ہیں۔"

حضرتِ عبّاسؑ کی شادی عبداللہ ابنِ عبّاس ابنِ عبدالمطلب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جن کا نام زکیّہ اور بروایتے لبابہ تھا۔ آپ کے بطن سے ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام فضل تھا اور دوسرے کا عبداللہ۔ اِسی سے آپ کی کنّیت ابوالفضل ہوئی۔

آپ کی وجاہت اور آپ کے رخ کی چمک دمک کا یہ عالم تھا کہ عرب آپ کو قمرِ بنی ہاشم کہتے تھے۔ آپ اس قدر جسیم اور کشیدہ قامت تھے کہ اگر رکابیں نکال دی جاتی تھیں تو قدم مبارک زمین پر خط دیتے جاتے تھے۔ اِسی لئے آپ دو رکابہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔

آپ کی شجاعت ضربُ المثل تھی، اور امام حسینؑ سے آپ کی محبت و اُلفت و وفا شہرۂ آفاق - آپ نے حسینؑ کی آغوشِ وفا میں آنکھ کھولی اور جب تک دم میں دم رہا نُصرتِ حسینؑ میں کوشاں اور اُن پر سو جان سے قربان رہے!

آپ نے صرف نَو برس کے سِن میں جنگِ صفّین میں امامِ ہمام کی رفاقت میں پامردی و ثابت قدمی کا وہ بے نظیر کارنامہ دکھایا جو آج بھی چہرۂ تاریخ کا غازہ بنا ہے اور اُس کی دلکشی میں اضافے کا سبب ہے۔

امامؑ کی مصلحت سے اظہارِ شجاعت کا موقع نہ مل سکا مگر اپنے دلی جذبات کو منشائے امام کے مطابق رکھنے میں حوصلوں اور ولولوں کا ایسا خون کیا اور ضبطِ شجاعت کے ایسے مظاہرے کئے کہ دُنیا حیران رہ گئی!

یوں تو حضرت عباسؑ کی ساری زندگی بایمائے امامؑ ضبطِ جذبات میں گزری لیکن اِس کی ایک بیّن مثال وہ فقرہ ہے جو آپ نے روزِ عاشورا زہیر ابنِ قین کے وجہ عقدِ اُمّ البنین یاد دلانے پر ارشاد فرمایا تھا۔

"زہیر! تم مجھے شجاعت سکھاتے ہو" آپ نے یہ فقرے ادا فرما کر ایک ایسی انگڑائی لی کہ رکابوں کے تسمے ٹوٹ گئے۔ اپنے جذبات کے خون کرنے کے متعدد موقعوں میں سے ایک بڑا المناک موقع وہ تھا جب روزِ عاشورا یہ علمدارِ حسینؑ ابنِ علیؑ آلاتِ حرب میں سے صرف ایک نیزہ لے کر پانی لانے کے لئے نہرِ فرات کی طرف بے جگری

کے ساتھ بڑھا جا رہا تھا۔

نہر کی کڑی چوکیاں پیڑ کے زرد پتّوں کی طرح ٹوٹ گئیں، پہرہ دار اپنے فرائض چھوڑ بھاگے، فوجِ شام میں کھلبلی پڑ گئی، دریا تک میں تلاطم ہو گیا لیکن تموّج پیدا نہ ہوا تو عبّاسؑ کے جذبات میں۔ نہ اپنے ہونٹوں کو پانی سے تر کیا نہ اعدا کو خون سے۔ بس پیشِ نظر رکھا تو امامؑ کا حکم "عبّاس جاؤ۔ ذرا پانی تو لے آؤ"۔

اِدھر یہ تمنّا کہ مشک بھر کر لے جائیں۔ اُدھر حسینؑ کی یہ آرزو کہ عبّاسؑ صحیح و سالم واپس آئیں۔

لیکن نہ تو یہ پوری ہوئی اور نہ وہ۔ اُدھر پہرے کی چوکیوں کو توڑ کر عبّاسؑ نہر میں ڈوبے اِدھر اہلِ حرم کی ڈوبتی ہوئی نبضیں اُبھر آئیں۔ اِدھر عبّاسؑ نے مشک بھری۔ اُدھر پانی آنے کی اُمّید سے سکینہؑ کے دم میں دم آیا۔ مشک بھر کر عبّاسؑ دریا سے کیا نکلے گویا دل کے ارمان نکلے اور اُمید بندھی کہ اب کوئی دم میں پانی آیا۔ مشک کا تسمہ بندھا تو زینبؑ نے اپنے بازوؤں پر کسی شے کی مضبوط گرفت کے بار کو ڈھیلا محسوس کیا اور جب علمدار نے رُخ اپنے خیام کی طرف کیا تو حسینؑ کے قلبِ سلیم کی عظمتوں نے بڑھ کر عبّاس کا استقبال کیا۔ لیکن ابھی اِن احساسات و جذبات کی رفعتیں اپنی حدِّ کمال کو نہ پہنچی تھیں کہ ظلم و ستم کی بجلیاں چاروں طرف سے گرنے لگیں، تیروں کا مینھ برسنے لگا، تلواریں چمکنے لگیں اور قمرِ بنی ہاشم جفاؤں کے بادلوں میں گھر گیا۔

پھر بھی یہ شیر اُن بھاگ کر پلٹتی ہوئی فوجوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن ایک اور ہزار کی یورش! آخر کب تک!! ایک بازو کٹ گیا اور پھر دوسرا بھی۔ پھر بھی خیامِ حسینی تک پانی پہنچانے کی مردانہ وار کوشش میں لگے رہے۔ مشک کا تسمہ منہ میں دبائے اور یہ صیحہ کرتے ہوئے خیمے کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے کہ "اب میں لڑ تو نہیں سکتا لیکن خدمتِ رسولؐ میں جلد سے جلد پہنچ تو سکتا ہوں۔" ناگاہ مشکیزے پر تیر لگا تو وقتی یاس کے باوجود فرات کی طرف پلٹ پڑے۔ لیکن اُدھر مشک کا اور اِدھر عباسؑ کے جسم کا خون اِس قدر بہہ چکا تھا کہ نہر تک پہنچنے سے پہلے ہی مشک پانی سے اور جسم خون سے خالی ہو گیا تھا۔ گھوڑے سے زمین پر آ رہے۔ پھر نہ علم جھک کر سیدھا ہوا اور نہ حسینؑ کی کمر!!

حسینؑ تلوار سونت کر شکاری باز کی طرح صفِ اعدا پر یہ کہتے ہوئے جھپٹے کہ "اے جفا شعارو! تم نے میرے برابر کے بھائی کو تو مار ڈالا۔ اب بھاگتے کہاں ہو۔" بھائی تک پہنچنے کی اِس جدّ و جہد میں حسینؑ کو عباسؑ کے شانے پہلے ملے اور لاش بعد کو ملی تو بھائی کی شجاعت کے تصوّر سے غم کے بادل اور اُمنڈ آئے۔ اور جب بھائی کو دم توڑتے دیکھا تو آنسوؤں کا ایک سیلاب آنکھوں سے جاری ہو گیا۔ لیکن اللہ، اللہ جذبۂ بے پناہِ وفائے علمدار کہ امامؑ میں مادی طور پر احساسِ ضعف کے بعید از بعید امکان کو بھی گوارا نہ کیا اور وصیت فرمائی کہ "میری لاش خیمے میں نہ لے جائیے گا۔ میں سکینہؑ سے بہت شرمندہ ہوں۔"

یہ کہا اور وفاداری کا نقش رہتی دنیا تک دلوں پر بٹھا کر اُسی آغوش میں دم توڑ دیا جس میں چونتیس ۳۴ برس پہلے آنکھیں کھولی تھیں ؎

اے علمدارِ حسینؑ ابنِ علیؑ جانِ وفا
تو نے دنیا کو دکھا دی حدِ امکانِ وفا

گو تو معصوم نہیں ہے مگر اللہ اللہ
اہلِ عصمت ہی سمجھتے ہیں تری شانِ وفا!!

ثانیٔ زہرا، جنابِ زینب صلوٰۃ اللہ علیہا۔ پیکرِ اخلاق، رسولِ اسلام کی نواسی، فاطمہؑ کی بیٹی اور افصح مخلوق حضرت علیؑ کی لاڈلی تھیں۔ مدینے میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا عقدِ نکاح عبداللہ ابن جعفرِ طیار کے ساتھ ہوا۔ آپ نے اپنے دونوں صاحبزادوں محمد اور عون کو روزِ عاشورا اسلحۂ جنگ سے آراستہ کر کے باصرارِ تمام امام سے اذنِ جہاد دلوایا۔ اور چلتے چلتے تاکید کر دی "دیکھو! نصرتِ امام میں کوتاہی کی تو مُنہ نہ دیکھوں گی، دودھ نہ بخشوں گی!" آپ نے اِس کے علاوہ بھی راہِ حق میں بڑی بے جگری اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ نہ صرف اولاد کی قربانی پر سجدۂ شکر کیا بلکہ بعدِ شہادتِ حسینؑ کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام تک کا سفر عزم بالجزم سے طے کیا۔

ہم نے بڑے بڑے سورماؤں اور ناموروں کو انسانوں کی چوکھٹوں پر ناک رگڑتے دیکھا ہے، نام نہاد خلیفۃ المسلمین کے چشم و ابرو پہ عالموں کو

ناچتے دیکھا ہے، امیر کے محض ایک اشارے پر عورت کو مسجد میں فرائضِ امامت انجام دیتے اور بظاہر ثقہ حضرات کو اُس کے پیچھے نماز پڑھتے اور ایک لونڈی کے جنازے کے ساتھ سر برہنہ با حالِ تباہ چلتے بھی دیکھا ہے اور یہ سب اُس وقت دیکھا ہے جب جان و مال کا کوئی فوری یا خاص خطرہ بھی اُنھیں لاحق نہ تھا۔ لیکن نہیں دیکھا تو ضمیر اور زبان کی قوت کا وہ بے نظیر مظاہرہ جو اس بے بس و ناچار عورت نے اُس وقت کیا جب سارا کنبہ کٹا اور بندھا ہوا نگاہوں کے سامنے تھا اور موت گویا آنکھوں کے سامنے رقص کر رہی تھی۔ بھلا ایسے ماحول میں کسی بڑے سے بڑے سورما کا بھی یہ حوصلہ ہوسکتا تھا کہ وہ یزید لعین ایسے جابر کو بھرے دربار میں ٹوک سکے!!

لیکن جس امرِ مہیب کی انجام دہی سے ایک دنیا عاجز تھی اُس کو فلک کی ماری اِس مصیبت زدہ عورت نے یوں انجام دیا کہ جرأتِ اخلاق آج تک انگشت بدنداں ہے۔

آپ جرأت ہی نہیں میدانِ صبر میں بھی ضبط و استقلال کے منارے قائم کر گئیں۔ اور جن پُرخطر حالات اور ہولناک ماحول میں آپ نے صبر فرمایا وہ صورت جنابِ فاطمہؑ کو بھی پیش نہیں آئی۔ حتّٰی کہ اپنی ظاہری بےکسی اور ظاہری اہانت کے نازک ترین موقعوں پر بھی ضبط و صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ بازاروں میں پھرائی گئیں، درباروں میں لائی گئیں، بھتیجے کو ہتھکڑیوں، بیڑیوں اور طوقِ خاردار میں جکڑا

دیکھتی رہیں لیکن کبھی مرضیِ الٰہی کے خلاف اُف تک نہ کی۔

اے ارثِ صبرِ فاطمہؑ زہرا کی لاڈلی حق ہے خطابِ ثانیٔ زہراؑ ترے لئے!

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح رسولِ اکرمؐ نے ذکور و اناث دونوں صنفوں کے دو حق کوش شاہکار فراہم کئے تھے اسی طرح حضرت علیؑ نے بھی دنیا کے سامنے عورتوں اور مردوں کے دو مثالی نمونے پیش کردئے تھے۔

اُنھوں نے اپنی تعلیم و تربیت کے فیض سے علیؑ و فاطمہؑ جیسے دو گراں قدر نمونے مہیّا کئے تو اِنھوں نے بھی عبّاسؑ و زینبؑ کے پیکر میں عالمِ انسانیت کو دو انمول ہیرے عطا فرمائے۔ جنھوں نے علیؑ و فاطمہؑ کی طرح شجرِ اسلام کو ہرا بھرا کیا اور حمایتِ حق میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ عبّاسؑ نے اپنی جرأت و شجاعت اور پامردی و وفاداری سے اور زینبؑ نے اپنی فصاحت و بلاغت اور تدبیر و ہوشمندی سے وہ وہ معرکے سر کئے جو آپ اپنی نظیر تھے۔ یہ دونوں بہن بھائی اگر حسینؑ کے دست و بازو نہ ہوتے تو کربلا کا میدان سُونا اور کوفے کا بازار بے رونق رہتا اور یزیدیّت اِس قدر جلد اپنے کیفرِ کردار کو نہ پہنچتی۔

اگر عبّاسؑ کے خون نے بہہ کر سرزمینِ کربلا میں وفا کے سدا بہار گُل کھلائے تو زینبؑ کے وا علیّاہ وا محمّداہ کے دلخراش نعروں نے

فضا کو معمور کیا۔ اگر اِسی خاکِ شفا میں آج تک بوئے وفا موجود ہے تو اُسی فضا میں آج تک نالہ وشیون کی صدا محفوظ۔ اگر عباسؑ نے اپنے بھائیوں کو اپنے سامنے حسینؑ پر نثار کیا تو زینبؑ نے بھی اپنے ہاتھوں سے سج کر اپنے بچّوں کو امام کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ اگر عباسؑ نے اپنے شانے کٹا کر وفا کا پرچم ہمیشہ کے لئے اونچا کر دیا تو زینبؑ نے بازوؤں میں رسّی بندھوا کر رشتۂ اُخوّت کو قیامت تک کے لئے مضبوط بنا دیا۔ ایک نے جہاد بالاعضاء کر کے سرزمینِ کربلا پر ضبط کے ساتھ شجاعت کا مظاہرہ کیا تو دوسرے نے جہاد بالنّفس کر کے صبر کے ساتھ فصاحت وبلاغت کے موتی بکھیر دیئے۔ مخالف فوجوں کی آمد کی اطلاع بیک وقت دونوں کو ہوتی تھی، ایک کو دیکھ کر اور دوسرے کو سُن کر۔ بچّوں کی پیاس کی خبر دونوں کو ملتی تھی، ایک کو سُن کر دوسرے کو دیکھ کر۔ رفقائے حسینؑ کی جانفشانیاں اور حُر کی آمد ایک آنکھوں سے دیکھتا تھا تو دوسرا کانوں سے سنتا تھا۔ ایک نے پانی لانے کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہا دیا، دوسرے نے العطش العطش کی آوازیں سُن کر خون کے آنسو بہائے۔ ایک نے میدان میں جا کر حسینی سپاہ کی پشت پناہی کی اور دوسرے نے خیمے میں رہ کر حرمِ حسینی کی نگہبانی۔ ایک نے سکینہؑ کی پیاس بجھانے کی کوشش میں جان دے دی تو دوسرے نے سکینہؑ کو طمانچوں سے بچانے میں دُرّوں کی بھی پروا نہ کی۔

مختصر یہ کہ جہاد فی سبیل اللہ اور اعلائے کلمۂ حق میں دونوں برابر کے شریک رہے اور رفاقتِ امامؑ دونوں نے کی۔ ایک نے شمشیر بکف اور دوسرے نے رسن بردست۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ ایک تو شمعِ امامت پر ایک دوپہر میں نثار ہوگیا اور دوسری صرف کربلا و کوفہ و شام میں نہیں بلکہ عمر بھر آتشِ غم والم اور بھائی کے فراق میں جلا کی ——

کجا ناگہاں جل کے نابود ہونا،
کجا برقِ سوزاں کا طوفِ نشیمن!!

(ماآنی جائسی)



(۶)

انصارِ حسینؑ کا جذبۂ مودّت!!

جاں نثاروں نے ترے کر دیے جنگل آباد
خاک اُڑتی تھی شہیدانِ وفا سے پہلے!

یہ شعر کربلا کے الم انگیز واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر نظم کیا گیا ہو یا نہیں۔ بہر حال المیۂ کربلا کی خاصی عکّاسی اور انصارِ حسینؑ کے کارناموں کو خوب اُجاگر کرتا ہے۔

۶۱ھ (مطابق ۶۸۰ء) کے ماہِ محرّم کے قبل نہ تو نہرِ فرات کو کوئی خاص شہرت حاصل تھی اور نہ ارضِ کربلا میں کوئی نمایاں جاذبیت تھی۔ لیکن اسی نہر کے بہتے ہوئے پانی کے سامنے انصارِ حسینؑ کی سہ روزہ تشنگی اور اسی میدانِ کربلا میں جان نثارانِ حسینؑ کی بہادری، بلند نظری، وفا شعاری اور حق نوازی کے مظاہروں نے فرات اور کربلا دونوں کو ایک عالم کے لئے مرکزِ فکر و نظر بنا دیا۔ سرزمینِ کربلا کی اُداسی اور بیرنگی کو جانبازانِ حسینؑ کے خون کے چھینٹوں نے دوامی رنگینی و دلکشی سے بدل دیا اور اُن کی فداکارانہ ریاضتوں نے ایک دوپہر میں قیامت تک کے لئے میدانِ کربلا کا یہ عالم کر دیا کہ آج تک وہاں کا ہر ذرّہ غمِ حسینؑ میں خاک بر سر و دل تپاں ہے۔ اور اُس کے درمیان میں بہتے ہوئے فرات کا ہر قطرہ اشک آلود و گریہ کناں! ان معمارانِ حقانیت

اور محافظانِ نورِ امامت میں صحابۂ رسولؐ بھی تھے اور حافظانِ قرآن بھی، زاہدانِ شب زندہ دار بھی تھے اور شجاعانِ آزمودہ کار بھی، قبیلوں کے رئیس بھی تھے اور اپنے عہد کے فصیح بھی، انھیں میں وہ بہادروں کا بہادر حبیب ابنِ مظاہر بھی تھا اور وہ مجاہدوں کا مجاہد بریر ہمدانی بھی۔ اور انھیں میں اکثر وہ بھی تھے جو کڑی چوکیوں اور پہروں سے بچ بچا کر اور اپنی جانوں پر کھیل کر گویا ہفتخوان طے کر کے حسینؑ کی نصرت کو آئے اور اپنی شجاعت و صداقت کا نقش جما کر ملکِ بقا کو سدھار گئے۔

ایسوں کے تذکرے کے لئے تو عمرِ نوحؑ کی مدت بھی کم ہے چہ جائیکہ چند دقیقوں کی فرصت ہو۔ مختصر اً بس یوں سمجھئے کہ اُن میں کے بوڑھے اور جوان، بڑے اور چھوٹے، آزاد اور غلام سبھی ایک رنگ اور گویا ایک جان اور متعدد قالب تھے۔ ظاہری فرق کے باوجود ان سبھوں کا ایک ہی مقصد تھا اور ایک ہی جادہ، ایک ہی کام تھا اور ایک ہی پیغام۔ یعنی اعلائے کلمۂ حق، تلقینِ صبر و تعلیمِ صداقت۔ مادی طور پر انصارِ حسینؑ میں چاہے جتنا بھی فرق کیوں نہ ہو روحانیت کی منزل میں سب ایک تھے۔

تاریخ کا ایک ایک ورق اور فضائے عالم کی ہر گزری ہوئی سانس شاہد ہے کہ وہ وقت عبادت ہو یا ہنگامِ جنگ، شبِ عاشور کا سناٹا ہو یا روزِ عاشورا کا ہنگامہ انصارِ حسینؑ سرزمینِ حق پر ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند تھے۔ موت آ آ کر اُن سے ٹکراتی تھی اور وہ مسکراتے تھے!

اکثر مورّخین کے بیان کے مطابق لشکرِ حسینؑ تیس ۳۰ سواروں اور چالیس ۴۰ پیادوں پر مشتمل تھا۔ اور فوجِ مخالف کی تعداد کم سے کم تیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ مگر حسینی مجاہدوں کے ناموں کی تفصیلات اور بعض دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسینی جماعت سو اور دو سَو کے درمیان تھی۔ اُن میں سے تقریباً بانوے ۹۲ انصار کا تھوڑا بہت حال معلوم ہوا ہے۔ اُنھیں میں سے بعض کا ذکر اس وقت کیا جاتا ہے۔

ابو ثمامہ صائدی۔ فوجِ یزید اور امام حسینؑ کے درمیان صلح کی گفتگو ہو رہی ہے کثیر ابن عبد اللہ عمر ابن سعد کا پیغام لے کر حسینؑ کی خدمت میں آنا چاہتا ہے۔ ابو ثمامہ صائدی پہرے پر ہیں۔ آپ کی وفاداری اجازت نہیں دیتی کہ وہ کثیر ابن عبد اللہ کو تلوار باندھے ہوئے امام کے پاس جانے دے۔ جب وہ تلوار رکھ دینے پر راضی نہیں ہوتا تو آپ فرماتے ہیں "میں تلوار کے قبضے پر اپنا ہاتھ رکھے بغیر تمھیں امام کے پاس ہرگز جانے نہ دوں گا"۔

جناب ابو ثمامہ صائدی کی یہ وفا شعاری جہاں قابلِ ذکر ہے وہاں آپ کا وہ جذبۂ طاعت گزاری بھی قابلِ رشک۔ ظہر کے وقت سب سے پہلے آپ ہی نے یہ خواہش کی تھی کہ امام کی قیادت میں نمازِ ظہر ادا فرمائیں۔ لیکن افسوس حبیب ابن مظاہر اور جنابِ حُر کے ساتھ آپ بھی اُس ہنگامہ میں شہید ہو گئے جو نماز کی اجازت حاصل کرنے کے سلسلے میں ہوا تھا اور امام کے ساتھ نمازِ آخر پڑھنے کی آرزو

دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

مسلم ابنِ عوسجہ۔ عاشورے کی رات بھیگ چکی ہے۔ شمع جل رہی ہے، امامؑ خیمے میں رونق افروز ہیں۔ اعزّا اور انصار گرد جمع ہیں حسینؑ نے اپنے رفقاء کی وفاداری کی تعریف کی۔ اُن کے بلند مراتب کا ذکر کیا اور اُن کو اپنی محبت کی سند دے کر ارشاد فرمایا۔ "دشمن محض میرے خون کے پیاسے ہیں۔ تم کیوں خواہ مخواہ اپنی جانیں دیتے ہو۔ راہیں کھلی ہیں تم چلے جاؤ اپنی جانیں بچاؤ۔ یہ لوگ مجھے پالیں گے تو تمھاری تلاش نہ کریں گے۔ لو میں شمع گُل کئے دیتا ہوں۔ جاؤ، چلے جاؤ۔" ایسے زہرہ گداز اور خطرناک محل سے ہٹ جانے اور جان بچانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن جہاں حسینؑ کا یہ شجاعانہ اقدام فقید المثال ہے وہاں انصارِ حسینؑ کا ثباتِ قدم بھی آپ اپنی نظیر ہے۔ ساتھ چھوڑ کر چلا جانا تو درکنار اِن بہادروں نے جو لفظیں اس محل پر کہیں وہ بجائے خود ناقابلِ انکار اخلاص کی آئینہ دار تھیں۔

"اگر ہم جلائے جائیں۔ اور پھر زندہ کئے جائیں اور پھر جلائے جائیں اور پھر زندہ کئے جائیں اور ایسا بہتّر دفعہ ہو تو بھی ہم شمعِ امامت سے جُدا نہ ہوں گے۔" "ہم آپ کو چھوڑ دیں اور خدا کے سامنے جوابدہی کی فکر نہ کریں؟ واللہ۔ یہ کبھی نہ ہوگا، خدا کی قسم میں دشمنوں سے نیزہ لے کر لڑوں گا یہاں تک کہ میرا نیزہ اُن کے سینوں میں ٹوٹ جائے۔

اور تلوار لگاؤں گا جب تک اُس کا قبضہ میرے ہاتھوں میں رہے گا۔ اور میں آپ سے کبھی جُدا نہ ہوں گا۔ اگر ہتھیار نہ ہوں گے تو میں اُنھیں پتھر ماروں گا اور آپ کی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر جان نثار کر دوں۔"

یہ لفظیں کسی جوشیلے نوجوان کی نہیں، زہیر ابن قین اور مُسلم ابن عوسجہ جیسے سنجیدہ بزرگوں اور پیر مردوں کی تھیں مسلم ابن عوسجہ کی عمر اُس وقت تقریباً اسّی برس کی تھی۔ اور پھر جب یہ لفظیں محض زبان سے ادا ہونے کی منزل تک ختم نہ ہو گئی ہوں بلکہ اگلے روز جنگ کی گھما گھمی میں بھی تلواروں کی جھنکار کے ساتھ اُسی طرح گونجی ہوں جیسے خیمۂ امام میں گونجی تھیں تو اُن کی قوّت و صداقت کا اندازہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

ناصرانِ حسینؑ نے قولِ مرداں جان دارد کے مصداق وہی کر دکھایا جس کا اعلان ایک رات قبل کیا تھا اور اپنی وفاداری کا سکّہ ایک عالم پر بٹھا دیا!

حبیب اور امام مظلوم مسلم ابنِ عوسجہ کے پاس میدانِ کارزار میں کھڑے ہیں۔ مسلم میں جراحتوں کی کثرت اور درد کی شدّت کی وجہ سے اِتنا بھی دم نہیں کہ آنکھیں کھول سکیں۔ حبیب نے پکارا مگر مسلم نے آنکھیں نہ کھولیں تو حبیب نے کہا "مسلم! دیکھو مولا

سرہانے کھڑے ہیں" گوشِ حق نیوش میں یہ آواز پہنچتے ہی مسلم نے زیارتِ امامؑ کی تمنا میں آنکھیں کھول دیں!!

حبیب نے کہا " اگر مجھے تمھارے بعد زندہ رہنا ہوتا تو کہتا کوئی وصیت کرو لیکن میں بھی تو اُسی راہ پر جلد ہی آنے والا ہوں جس پر تم جا رہے ہو۔ پھر بھی کچھ کہنا ہو تو کہو، وصیت کرنا ہو تو کرو۔" مسلم نے کمزور اور کانپتے ہوئے ہاتھ کو اُٹھا کر انگلی سے حسینؑ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا "اُوصِیکَ بِھٰذا !" " حبیب بس اِن کا ساتھ نہ چھوڑنا۔"

زہیرؓ ابنِ قین۔ یا تو دورانِ سفر میں ایک وقت تک امامؑ سے دُور دُور رہتے تھے یا جب حسینؑ سے آکر ملے تو اور تو اور جنابِ عباسؑ کو وجہِ عقدِ اُمّ البنین یاد دلا کر گویا شیر کو شکار کرنا سکھانے لگے۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے امامؑ کے سامنے نماز کے وقت کھڑے ہو کر تیروں کو سینے پر روک کر بیک وقت بے نظیر شجاعت کا مظاہرہ بھی فرمایا۔ اِس جانباز کے خود نمازِ ظہر نہ پڑھنے لیکن دوسرے نمازیوں کے لئے اپنے سینے پر تیر لینے کی منزلت کتنی ہے۔ اِسے یا تو امام جان سکتے ہیں یا پھر وہ جس کی نماز قائم رکھنے کے لئے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا۔

نافعؓ ابنِ ہلال۔ حضرت کے ایک اور ناصر نافع ابنِ ہلال آپ کے ساتھ سایہ دار رہتے تھے اور کسی وقت جدا نہ ہوتے تھے۔ جب امام خیمے میں تشریف لے جاتے تو آپ درِ خیمہ پر بیٹھ کر امامؑ کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔ شبِ عاشورا آپ نے جنابِ زینبؑ کو جب یہ کہتے

سُنا " بھیّا! آپ نے ساتھیوں کو آزما تو لیا ہے۔ ساتھ دیں گے نا؟"
تو بدحواس ہو گئے۔ دوڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے پاس آئے۔
کہنے لگے " بڑا غضب ہو گیا! تم لوگ یہاں تلواروں کو صیقل اور سرفروشی
کی تیاریاں کر رہے ہو اور وہاں رسولؐ کی نواسی کو ہم پہ اعتماد نہیں"!
بس یہ سُننا تھا کہ ناصرانِ حسینؑ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نیاموں کو جلتی
ہوئی خندق میں جھونک دیا اور خیمے کے قریب پکار پکار کر کہنے لگے
" اے شہزادی! اپنے اعتماد کا یقین دلائیے اور ہماری وفا کا اعتبار
کیجئے ورنہ ہم اپنی گردنیں خود اپنی تلواروں سے کاٹ کر اپنے جذبۂ وفا کو
ثابت کر دکھائیں گے"!!

ایسے باوفا انصار میں سے اگر بعدِ عصرِ عاشورا ایک بھی زندہ ہوتا
تو زینبؑ کے شانوں میں رسن کیوں بندھتی اور سکینہؑ کے رخسارے
طمانچوں سے زخمی کاہے کو ہوتے!!

جنابِ نافع عابدِ شب زندہ دار تو تھے ہی ماہر تیر انداز بھی تھے۔
انھوں نے تیروں پر اپنا نام لکھ کر اُن کو زہر میں بُجھا رکھا تھا۔ ان تیروں
سے آپ نے مخالف گروہ میں سے بہتوں کو مار گرایا اور زخمی کیا۔ بالآخر
جب دشمنوں نے زخمی کر کے آپ پر قابو پا لیا اور گرفتار کر کے عمرِ سعد کے
پاس لے گئے تو آپ کی داڑھی سے خون بہہ رہا تھا۔ عمرِ سعد نے پوچھا
" نافع تم نے اپنے نفس کے ساتھ یہ کیا کیا؟" نافع نے جواب دیا۔

"میرے ضمیر کا علم تو اللہ کو ہے۔ مگر میں خوش ہوں کہ میں نے ادائے فرض میں کوئی کمی نہیں کی۔ اور تمھارے بارہ آدمی جان سے مار ڈالے اور بہتوں کو زخمی کر دیا۔ اور اگر میرے بازو ٹوٹ نہ جاتے تو مجھ کو تم بھلا کیا پکڑ پاتے"۔

حُرؓ۔ مہاجر بن اوس حضرتِ حُر ہی کے قبیلے کا آدمی تھا۔ روزِ عاشورا اُس نے حُر کو دیکھ کر پوچھا "حُر! کیا حملہ کرنے کا ارادہ ہے؟"۔ حُر نے جو حملے کا لفظ سُنا تو چہرہ متغیّر ہو گیا، جسم کا جوڑ جوڑ بولنے لگا لیکن دل و دماغ میں جو شدید کشمکش ایک ہنگامہ برپا کئے تھی وہ جواب دینے سے مانع رہی۔ آپ اِس کشاکش سے اِس قدر متاذّی ہوئے کہ بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ مہاجر نے حُر کی یہ حالت دیکھی تو گویا ہمت افزائی کے لئے کہا "آج سے پہلے کوئی مجھ سے پوچھتا کہ عرب میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے تو میں تمھارا ہی نام لیتا۔ لیکن تم کو تو آج نہ معلوم کیا ہو گیا ہے"! یہ فقرے حُر کی شجاعت پر طنز کی نوعیت رکھتے تھے۔ جناب حُر اِس چوٹ کی تاب نہ لا سکے۔ فرمایا "مہاجر! میں بہشت اور دوزخ کے دوراہے پر کھڑا ہوا ہوں"۔ اِس جملے کے ادا کرنے کے ساتھ ہی آپ نے گویا اِس مشکل سوال کو حل کر لیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور یہ کہتے ہوئے اُس کو تیزی کے ساتھ ترائی میں ڈال دیا۔ "میں تو بہشت پر کسی چیز کو مقدّم نہ کروں گا۔ چاہے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں اور میں آگ میں جلا دیا جاؤں"۔ آپ نے گھوڑے کو

ایسا تیز دوڑایا کہ اُس کا پیٹ زمین سے لگ گیا۔ مگر اِس خیال سے
کہ کہیں فوجِ مخالف کے کسی سپاہی کو یہ آمد سوئے ظن نہ پیدا کرے
آپ نے ڈھال اُلٹی کر لی۔ جنابِ عباسؑ نے حُرؒ کے اِس سپاہیانہ
اندازِ صلح کا اندازہ کر لیا۔ اور امام حسینؑ اپنی معرفت سے سمجھ گئے کہ حُر
جنگ کرنے کو نہیں، معذرت کو آ رہا ہے، شرمسار آ رہا ہے۔ چنانچہ
کسی نے بھی حُرؒ سے نہ پوچھا کہ وفادار رہو گے؟ بقول غالب مرحوم
"اپنے پہ اعتبار ہے، غیر کو آزمائے کیوں!!"

شوذبؒ و عابسؒ ۔ جنابِ عابسؒ نہ صرف نام سے شیر تھے
بلکہ آپ کے شیروں ہی کے سے شجاعانہ طور و انداز بھی تھے۔ آپ نے
اپنے غلام شوذب ابن عبداللہ سے کہا کہ اگر میرے کوئی بیٹا، بھائی
یا بھتیجا ہوتا تو میں پہلے اُسے حسینؑ پر نثار کرتا۔ لیکن چونکہ سوا تیرے کوئی
اور اِس وقت میرے پاس نہیں ہے اس لئے میری آرزو ہے کہ پہلے
تو میرے سامنے حسینؑ پر قربان ہو جا، تاکہ میں تیرا داغ اُٹھا کر شہادت
کی سعادت حاصل کروں۔ شوذب یہ سنتے ہی میدانِ قتال کی طرف
بڑھا تو آپ نے باحترامِ نظم و ضبطِ حسینی پوچھا "کدھر چلے"؟ اُس نے
کہا "مرنے کو" آپ نے فرمایا "بس تو نے میری اجازت کافی
سمجھ لی۔ جا مولا سے اجازت لے"!

اِس غلامِ نیک فرجام کی شہادت کے بعد جنابِ عابسؒ خود
بغرضِ جہاد میدانِ کارزار میں تشریف لائے اور فوجِ مخالف کو للکار کر

کہا "تم میں کوئی مرد ہے؟" بزدل فوجِ اشقیا نے جواب دینے کے بجائے پتھراؤ شروع کر دیا۔ اس شجاع نے یہ دیکھا تو زرہ بھی اُتار کر پھینک دی صرف کرتا پہنے ہوئے شمشیر زنی کے جوہر دکھانا شروع کر دئیے۔ اور تاریخ نے شجاعت کے اس مظاہرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا۔

انسؓ بن حارث ۔ انس بن حارث اسدی اصحابِ رسولؐ میں سے تھے ۔ جہادِ کربلا کے وقت آپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ آپ نے امامؑ سے اجازتِ جہاد لی، عمامہ سے کمر کسی، لٹکی ہوئی بھوؤں پر رومال باندھا اور فوجِ مخالف کی طرف گویا جوان بن کر رُخ کیا۔ امامؑ آپ کے اس سرفروشانہ اور مجاہدانہ انداز کو دیکھ کر رو دئیے اور دعائے خیر فرمائی۔

بُشرؓ بن عمرو ۔ بشر بن عمرو وہ جانباز سپاہی تھے جو روزِ عاشورا اپنے لڑکے کے گرفتار ہو جانے کی خبر پانے کے باوجود امام حسینؑ کو چھوڑ کر نہیں گئے۔ حالانکہ امامؑ نے اپنی بیعت اٹھا لی تھی اور آپ کو اجازت دے دی تھی کہ اپنے لڑکے کی گلو خلاصی کے لئے چلے جائیں۔

یزیدؓ بن زیاد بنِ مُہاصر ابوالشعثا ۔ شیعیانِ کوفہ میں سے تھے۔ بڑے شریف، دلیر، نبرد آزما اور تیر اندازی میں ماہر۔ اِن کے پاس صرف آٹھ تیر تھے۔ روزِ عاشورا گھٹنے ٹیک کر امامؑ کے سامنے بیٹھ گئے اور تیر چلانا شروع کر دیا۔ اور آٹھ میں سے پانچ ٹھیک نشانے پر

بیٹھے - تیر ختم ہو گئے تو پھر تلوار سونت کر میدان میں پہنچے اور دادِ شجاعت دے کر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے -

غلام ترکی[11] - امام حسینؑ کے انصار میں بہت سے آزادوں کے ساتھ ساتھ بعض غلام بھی تھے جنھوں نے آزادوں کے برابر نصرتِ امامؑ کا حق ادا کیا - اُنھیں میں سے ایک غلام ترکی بھی تھا - یہ حافظِ قرآن اور اولاً امامؑ کا غلام تھا - امام حسینؑ نے اُسے اپنے بیٹے سیّد سجّادؑ کو ہبہ کر دیا تھا - اِس غلامِ ترکی نے امامؑ سے اذنِ جہاد مانگا تو آپ نے سیّدِ سجادؑ سے اجازت حاصل کرنے کو کہا - غلامِ ترکی نے بیمارِ کربلا سے اجازتِ جہاد لی - تمام اہلِ حرم کو سلامِ رخصت کیا اور میدان کو چلا تو سیّدِ سجادؑ نے خیمہ گاہ کا پردہ ہٹوا کر اپنے غلام کے ایمان افروز جہاد کا بہ نفسِ نفیس مشاہدہ فرمایا - ہنگامِ شہادت امام نے یہ قدردانی کی کہ غلام کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس کے رخسار پر اپنا رخسار ملنے لگے - غلام نے آنکھیں کھول دیں اور پھر مسکرا کر ہمیشہ کے لئے بند کر لیں -

سعید ابن عبداللہ حنفی[12] - آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نمازِ ظہر کے وقت امامؑ کے آگے کھڑے ہو کر جدھر سے بھی تیر آتا تھا اُسے بڑھ کر اپنے سینے پر روکتے تھے - اور اُسے حسینؑ تک پہنچنے نہ دیتے تھے - اِس طرح بارہ تیر کھانے کے بعد جب امامؑ نے سلام پھیرا تو سعید نے آپ کی طرف رُخ موڑا - امامؑ کے چہرے پر نظر کی اور حسینی صبر و رضا کا عکس اپنی آنکھوں میں اُتار کر دُنیا سے

رخصت ہو گئے۔

سُوَیدؓ بن عَمرو ۔ آپ بڑے عابد، زاہد اور طاعت گزار تھے۔
بڑھاپے کے باوجود آپ نے روزِ عاشورا مردانہ وار جہاد فرمایا۔ اور اِس قدر
بیدم ہوئے کہ سب سمجھے شہید ہو گئے۔ مگر جب بعدِ عصر قُتِلَ الْحُسَیْنُ
کی آواز کانوں میں پڑی تو بے قرار ہو گئے۔ تلوار تو یزیدی لے جا چکے
تھے۔ آپ کے پاس صرف ایک چھُرا باقی تھا۔ اُس سے دشمنوں پر
حملہ آور ہوئے اور آخرکار شہید ہو کر زندۂ جاوید ہو گئے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد ز عشق!!

ذوالجناحؑ ۔ انصارِ حسینؑ کی فہرست میں ایک ناصر، مُعین،
مددگار یا ساتھی اور بھی تھا جو خود امامؑ کی شجاعت اور آپ کے صبر
و تحمل نیز بیکسی و بے بسی میں شریک اور اپنے کارنامے کے اعتبار سے
منفرد تھا۔ اِس کا ذکر دوستوں کے دلوں کو گرماتا اور دشمنوں کے کلیجوں کو
برماتا ہے۔ یہ حسینؑ کا آخری ساتھی تھا۔ جو اُس وقت بھی امامؑ کے
ساتھ رہا جب آپ کا نہ کوئی اور مونس تھا نہ رفیق، نہ یاور تھا نہ ناصر!!

بقولے:۔ نہ لشکر ہے، نہ سپاہ ہے، نہ کثرت اَلنَّا سے
نہ قاسم ہے، نہ علی اکبر ہے، نہ عبّاس ہے!!

اسی نے رُک کر ارضِ نینوا کا پتا دیا تھا اور یہی عُقاب کی طرح اُڑتا
ہوا ہر ناصر و عزیز کی لاش پر امامؑ کو لے جاتا تھا۔ اسی نے خیمے سے
رخصت ہوتے وقت قدم نہ بڑھا کر امامؑ کو خبر دی تھی کہ سکینہؑ سُموں سے

لپٹی ہے۔ یہی وہ تھا جس پر حسینؑ جہادِ آخر کے لئے سوار ہو کر گئے تھے اور جس کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی ذوالجناح تھا۔ ممکن ہے عُرفِ عام میں اِس حیوان کو انسانوں کی فہرست میں شامل نہ سمجھا جائے۔ لیکن لشکرِ یزیدؔ میں انسان نما حیوانوں کا جو ازدحام تھا اُس کا اندازہ کرتے ہوئے یہ جانور اُن نام نہاد انسانوں اور کلمہ گویوں سے بہرحال بہتر تھا۔

جب تک حسینؑ مصروفِ جہاد رہے ذوالجناح نے برابر آپ کا ساتھ دیا اور جب الامان و الحفیظ کی آواز سُن کر حسینؑ نے تلوار نیام میں کر لی اور عرشِ زین سے فرشِ زمین پر آئے تو یہ آپ کا نگراں رہا۔ حسینؑ شہید کر دیئے گئے تو اُس نے خونِ حسینؑ سے پیشانی کو رنگین کیا اور آقا کی نشانی لے کر خیمے کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر ایک دردناک آواز سے صیحہ کیا۔ اہلحرم نے زین خالی اور باگیں گری ہوئی دیکھیں تو واحُسیناہ کی صدائیں بلند ہو گئیں!

بالی سکینہؑ سُموں سے لپٹ گئیں اور پوچھنے لگیں "میرے بابا کو کہاں چھوڑ آیا"

ذوالجناح حسینؑ کی چہیتی، یتیم بچّی کے استفسار کا جواب کیا دیتا۔ بس اشکوں سے مُنہ دھونے لگا اور وہیں اپنا سر

زمین پر پٹک پٹک کر جان دے دی ۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!!

نوٹ ۔ اِس تقریر میں بعض انصار کا تذکرہ بہ تغیرِ الفاظ و ترتیبِ بیان کتاب "شہیدِ انسانیت" مصنفۂ مولانا علی نقی سے ماخوذ ہیں ۔

(۷)

روزِ عاشورا کے مناظر کی کیفیت!!

خونِ دل ہے دوامِ رنگینی — غم ہے موجد چمن طرازی کا (فانی جائسی)

یوں تو خیر و شر کے تصادم، حق و باطل کی دار و گیر اور انسانیت و شیطنت کی ٹکر کی آوازیں فضائے تاریخ میں گونج رہی ہیں اور گونجتی رہیں گی۔ کاشانۂ تاریخ کے جھروکوں سے بہتیرے عبرت انگیز مناظر دکھائی دیتے ہیں اور آیندہ بھی دیکھے جاسکیں گے۔ دامنِ تاریخ خون کے چھینٹوں سے رنگین ہے اور بے گناہوں کا خون اُس کی رنگینی میں اضافہ کرتا ہی رہے گا۔ لیکن سنہ ۶۱ھ (مطابق سنہ ۶۸۰ء) کے عاشورا کو اپنے عبرت زا و حیرت افزا مناظر کی "دوامِ رنگینی" اور اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے جو خصوصیت اور انفرادیت حاصل ہے وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ وہ صبحِ عاشورا کی پُرہول فضا میں گونجتی ہوئی اذان، وہ نمازیوں کے اوراد و وظائف، وہ تلاوتِ قرآن، وہ راہِ حق میں غلاموں کا آزادوں پر سبقت لے جانے کا ولولہ، وہ بوڑھوں کا جوانوں سے بازی جیت لینے کا مردانہ فیصلہ، وہ بچوں کا جوانوں سے پہلے جان دینے کا حوصلہ، زخموں سے چُور چُور ہو جانے کے بعد بھی

وہ "قولِ سدید" کہنے کا طنطنہ، عین لڑائی میں وہ فریضۂ نماز بجالانا اور نمازیوں کے لئے فضا کو پُر امن بنانے کے لئے ساتھیوں کا وہ تیروں کی بوچھار کو سینہ تان کر روک لینا، وہ تیروں کا سینوں سے ریلنا، وہ تلواریوں کے جھرمٹ میں دھنس جانا، وہ تیروں کی سنسناہٹ میں سکون و وقار سے چلنا، وہ برچھیوں کے پھلوں سے کھیلنا، وہ سقائی، وہ جاں نثاری، وہ باحواسی، وہ ثابت قدمی، وہ پامردی، وہ بے جگری کہ العظمۃ للہ! یہ وہ مناظر ہیں جنھوں نے فطرت کی دُنیا کو بدل کر نئی زمین اور نیا آسمان اور صاحبانِ دل کے لئے ایک نیا میدانِ فکر و نظر پیش کر دیا تھا۔

مختصر یہ کہ مظالم کی سنگینی اور شیطنت کی شر انگیزی کے مقابلے میں انسانیت کی بلندی، روحانیت کی پُر کیفی اور معصومیت کی دلکشی کے جو مناظر عاشورا کی دوپہر پیش کرتی ہے جُگوں اور صدیوں کی تاریخ اجتماعی طور پر بھی نہیں پیش کر سکتی۔ اور فرض کیجیے پیش کر بھی سکے تو والہانِ شہادت کا وہ مقصدِ سرفروشی اور تائیدِ حق میں وہ گرم جوشی کہاں سے لائے گی۔ شیب میں شباب کا رنگ کہاں سے پیدا کرے گی۔ اور اگر یہ بھی فراہم کر سکی تو بے زبان مجاہد کی پُر عظمت قربانی کہاں سے پیش کرے گی اور یہی وجہ ہیں کہ روزِ عاشورا کا ہر "نظارہ" دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست! کا مصداق ہے۔

کہیں، بچپن کا کوئی حبیب ابرؤں پہ پٹی باندھ کر جوانی کے

پیدا کرنا چاہتا ہے تو کہیں ایک بوڑھا غلام، بقول خود، اپنے سیاہ خون کو حق پرست آقا کے نورانی خون میں ملا کر سرخ روئی حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے۔

ایک ماں بیٹے کے کٹے ہوئے سر کو میدانِ جنگ کی طرف پھینک رہی ہے کہ راہِ حق میں جو دے دیا اُسے ہم واپس نہیں لیا کرتے۔ تو دوسری ماں اپنے بچّوں کو عروسِ موت سے ہمکنار ہونے کے لئے ہتھیاروں سے سج سجا کر دولھا بنا رہی ہے اور میدانِ جنگ کی طرف یہ کہہ کر بھیج رہی ہے "جاؤ جان دے کر واپس آنا"۔ ایک طرف جوان بیٹا زخموں سے چور شدّتِ عطش سے بیتاب ہو کر باپ سے پانی مانگ رہا ہے تو دوسری طرف کم سن بھتیجا مرنے کی رضا لیکن بوڑھے مجاہد کو نہ اُس پر قدرت ہے اور نہ اِس کی تاب! چشمِ نظارہ ششدر ہے کہ کس منظر کو دیکھے کس کو نظر انداز کر دے۔ اور عقل حیران ہے کہ کس روداد کو بلند کہے اور کس کو پست۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فوجِ مخالف کے ایک حُرّیت پسند سردار کے کھلے بندوں حسینی قافلے کی طرف شجاعانہ انداز میں بڑھے چلے آنے کا منظر زیادہ نظر فروز تھا یا کسی باوفا کا اُس آنے والے کو ٹوکنے کا جذبہ۔ عاشورا کا وہ منظر زیادہ ہمت افزا تھا جب ایک مجسمۂ شجاعت آقا اپنے غلام سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ارادہ ہے یا وہ منظر جب ایک مجسمۂ وفا بھائی اپنے چھوٹے بھائیوں سے یہ کہہ کر راہِ حق میں لڑنے مرنے کی خواہش کرتا تھا کہ

"تمھارے تو بیوی بچے بھی نہیں ہیں"۔ یا اُسی مجاہد کے خیمے سے برآمد ہونے کا وہ منظر کہ گویا اقتدار اسلام کا خود سر پہ ہے اور ملوکیت کو کچلنے والی کفش پاؤں میں، وفا کی زرہ بر میں ہے اور اُمیدوں سے بھری ہوئی تیغ کی خالی مشک دوش پر، حبل اللہ بہ شکلِ لجامِ فرس ہاتھ میں ہے اور اسلام کے روشن ماضی اور روشن تر مستقبل کا پرچم پہلو میں، انسانیت کے مٹانے والوں کو فی النّار کرنے اور آقا کے دشمنوں کے دلوں کو پرو لینے والا نیزہ کنونیوں کے بیچ میں، اور شعاعِ مہر کو ماند کر دینے والا نور پیشانی میں۔ اور یہ سب سمجھ میں آ بھی جائے تو یہ کیسے سمجھ میں آئے کہ جوان مردوں کی لاشوں پر لاشیں اُٹھا لانے کے بیسیوں منظر زیادہ صبر آزما تھے یا کسی شش ماہے کی لاش کو سینے سے لگا کر خیمے کی طرف بڑھنے اور پھر پلٹنے کا وہ ایک منظر یا عاشورے کی عصر کا وہ منظر جب ستاون برس کے سِن اور جھکی ہوئی کمر کے باوجود ایک بوڑھا مجاہد تن تنہا اعلانِ کلمۂ حق کر رہا تھا۔ وہ سنئے، گوشِ دل سے سُنئے، آج بھی بلندی سے هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا۔ هَلْ مِنْ مُغِيثٍ يُغِيثُنَا کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے!!

نہ معلوم اس بوڑھے مجاہد کی کمزور آوازِ استغاثہ میں کس غضب کا زور تھا کہ اُس نے بیک وقت دو اہلِ دل کو متاثر کیا۔ اس آواز کو سُن کر ایک نے تو شدّتِ عطش کو بھلا کر اپنے کو جھولے سے گرا دیا۔ اور دوسرے نے غش سے آنکھیں کھول دیں۔ بسترِ بیماری پر کروٹ لی۔

اور فرمایا" پھوپھی امّاں - ذرا میری تلوار تو دیجیے" پھوپھی نے پوچھا "بیٹا! تم اِس شدّتِ تپ میں تلوار کیا کروگے؟" بیمار نے جواب دیا "آپ سُنتی ہیں؟ بابا استغاثہ فرما رہے ہیں" فرمایا - خوب سُن رہی ہوں - لیکن تمھاری منزلِ جہاد تو کربلا نہیں، شام ہے اور تمھارا آلۂ حرب تو شمشیرِ آبدار نہیں، طوقِ خاردار ہے"

اِس آوازِ استغاثہ کے بعد عرصۂ کربلا پر کچھ دیر کے لئے سنّاٹا چھا گیا - جو اِسی بوڑھے مجاہد کی اِس آواز سے ختم ہوا" اے فضّہ! اے زینب! اے اُمّ کلثوم! اور اے اہلِ خیمہ! میرا آخری سلام قبول کرو" بوڑھے مجاہد نے عورتوں کو تو یوں رخصت کیا - اور بیمار بیٹے سے گویا یہ کہتے ہوئے جہادِ آخر کے لئے چل کھڑے ہوئے -

ناؤ منجدھار میں ہے شورِ تلاطم جانو
ناخدا جاتا ہے گھر جانے بس اور تم جانو!!

رہوار پاس کھڑا ہے لیکن بدن اس قدر زخمی ہے کہ گھوڑے پر چڑھنا دشوار ہے - کون ہے جو سوار کرائے - زخموں سے چُور مجاہد داہنے دیکھتا ہے، کوئی نہیں - بائیں دیکھتا ہے، کوئی نہیں - پردہ دار لیکن نبّاضِ فطرت بہن نے ضرورتِ مصلحتِ وقت کا احساس کیا، زینبؑ نے چادر اوڑھی - سراپردۂ عفّت و طہارت سرکا - بہن نے آکر رکاب تھامی اور بھائی کو جہادِ آخر کے لئے رخصت کر دیا!!

اِدھر اِس شجاعت کے دھنی مجاہد نے میدان کا رُخ کیا۔ اُدھر اہلِ دل کو فضا میں مختلف قسم کی آوازیں گونجتی ہوئی سنائی دیں۔ بوڑھے مجاہد کے کانوں میں "یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" کی صدا آنے لگی۔ اور بہن نے "اُقَادُ ذَلِیْلًا" کی آواز سُنی۔ اِنھیں آوازوں میں مِلا جُلا ایک دلدوز بَین بھی سُنائی دیا "میرے لال! دُکھیا ماں تیری ہمّت و استقلال کے نثار"۔

دوپہر کی دُھوپ سر پر گزر جانے، ساتھیوں اور عزیزوں کا غم اٹھانے، باوفا بھائی کی جُدائی سے کمر ٹوٹ جانے، جوان بیٹے کے ساتھ آنکھوں کی بصارت چلی جانے کے بعد بھوکے پیاسے مجاہد میں بھلا جنگ کرنے کا حوصلہ اور نبرد آزمائی کا ولولہ کیا ہوگا! لیکن کربلا کا ذرّہ ذرّہ اور نہرِ فرات کا قطرہ قطرہ گواہ ہے کہ جب یہ غم زدہ اور بھوکا پیاسا مجاہد تلوار لے کر حملہ آور ہوا تو گزشتہ بہادروں کے کارنامے محو ہو گئے اور تاریخ نے شجاعت و جراءت کے اِس مظاہرے کو اپنے دامن کو ابدالآباد تک کے لئے محفوظ کر لیا۔ ستم شعاروں نے الامان والحفیظ کی آوازیں بلند کرنا شروع کر دیں!!

اِدھر تو شریفُ النّفس مُجاہد کو رحم آگیا اور تلوار میان میں رکھ لی۔ لیکن اُدھر ظلم نے زور پکڑا۔ تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینھ برسنے لگا۔ اور بوڑھا مُجاہد سیکڑوں زخم کھا کر زمین پر گر پڑا۔ اِس زخمی کی طرف ایک

شقی خنجر بکف میدان سے چلا اور ایک ننھا کمسن بچّہ ماں کے ہاتھوں
سے دامن چھڑا کر خیمے سے دوڑا۔ قریب پہنچ کر للکارا۔ "خبردار!
جو میرے چچا کو قتل کیا۔" کھنچی ہوئی تلوار ننھے بچّے کے اُٹھے ہوئے
ہاتھوں پر پڑی، ہاتھ جھول گئے اور بچّہ چچا کی گود میں آرہا۔ چچا نے
بھتیجے کو سینے سے لگایا، مُنھ پر مُنھ رکھا اور ابھی شجاعت و شفقت کا
یہ منظر ادھورا ہی تھا کہ ایک تیر نے چچا کی گود میں اُس بچّے کا کام
تمام کر دیا۔ بوڑھے مجاہد نے بھتیجے کے تارِ نفس کو ٹوٹتے دیکھا مگر
رشتۂ صبر کو ٹوٹنے نہ دیا۔ اِس عاشقِ جانباز نے اپنا خون آلود
چہرہ آسمان کی طرف بلند کر کے خدا کو گواہ قرار دیا اور پھر زخمی پیشانی کو
گرم زمین پر رکھ کر ہنگامِ عصر آخری سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور بس اِسی سجدے
کے بعد "قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَاءِ وَ ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَاءِ" کی
آوازیں فضا میں پھیل گئیں، اہلِ حرم کے دل ہلنے لگے۔ شاید یہ
صدائیں کانوں میں مدّتوں گونجا کرتیں اگر شہدا کی لاشوں کو پامال
کرنے والے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں نے اُنھیں دبا نہ دیا ہوتا۔
لیکن ابھی ظالموں کے ترکش کے سب تیر ختم نہیں ہوئے تھے۔ آہ!
خیام میں آتشزنی، زیوروں کا لوٹنا، چادروں کا چھیننا، دُرّوں کا
لگانا، طمانچوں کا مارنا شروع ہوا۔ پھر جب کوئی ٹوکنے والا بھی نہ ہو
تو ظلم و جور کی حدّ کہاں۔!!

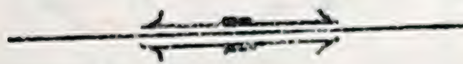
جب تک بس چلا۔ ایک جلتے ہوئے خیمے کے بعد دوسرے

خیمے میں عورتوں اور بچوں نے پناہ لی اور جب نوبت آخری خیمے کی بھی آگئی تو بیمار بھتیجے کے پاس غمزدہ پھوپھی نے جا کر پوچھا "بیٹا! کیا حکم ہے جل کر مر جائیں یا خیمے سے باہر نکل جائیں؟" امامِ وقت نے فرمایا۔ "پھوپھی جان! یہ آتش زنی در بدری کا پیش خیمہ ہے۔ بالوں سے مُنھ چھپا لیجیے اور جانوں کو ہلاکت سے بچائیے!!"

اب تو اپنے حامیوں کی جدائی سے دل برشتہ بیبیاں اور ظالموں کے طمانچوں کی زخم خوردہ بچیاں خیمے سے باہر نکل آنے پر مجبور تھیں۔ فضا اُن کے شیون و شین سے گونج رہی تھی اور جلے ہوئے خیموں کے پاس غریب الوطن بیواؤں اور یتیموں کی آہوں کے دھوئیں اُٹھ رہے تھے۔ اِس عالم میں کہ

نہ بینی ہیچ برسر خازنانِ گنجِ عصمت را
مگر در خارہ و بن ہا تار و پودِ طیلساں بینی
ہمانا سیلِ آتش بُردہ بُنگاہ غریباں را
کہ ہر جا پارۂ از رخت و موجے از دُخاں بینی

(غالب دہلوی)



(۸)

کربلا سے کوفے تک حادثات کی نوعیت!

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی
کہ در دے آدمِ آلِ عبا را ساربان بینی
نہ باشد کارواں را بعدِ غارت رخت و کالائے
زبادِ غم بود گر ناقہ را محمل گراں بینی
(غالب دہلوی)

کیا تعجب جو اِنھیں زہرہ گداز واقعات کے تصوّر سے سنہ ۶۱ھ (مطابق ۶۸۰ء) کا ہلالِ محرّم اُفقِ کربلا پر رُندھا رُندھا اور اُداس اُداس نکلا ہو اور محوِ حیرت ہو کر پیش آنے والے حادثات و سوانح کو کبھی کُھلے بندوں اور کبھی پردۂ آفتاب میں چھپ کر دیکھا ہو اور ہلالِ محرّم ہی پر کیا منحصر ہے کائناتِ کربلا کے ہر ثابت و سیّار نے کسی نہ کسی منزل پر اُن شدائد و مصائب کو دیکھا جن کی نظیر تاریخ پیش نہیں کر سکی۔ وہ شطِّ فرات پر خیام اہلبیتِ رسولؐ کا نصب ہونا اور اُکھاڑا جانا، وہ یزیدی فوجوں کا موج در موج آنا، وہ حق پرستوں کا کڑی چوکیوں کو توڑ کر امامؑ کے قدموں پر اپنے سروں کو ڈال دینا، وہ تا حدِّ امکان بہ تحفّظِ اُصول امامؑ کا صلح کے لئے جد و جہد کرنا، وہ ساتویں سے

خانوادۂ رسولؐ پر پانی بند کر دیا جانا، وہ نویںؑ کی شام کو فرزند مولا علیؑ حضرت ابوالفضل العبّاسؑ کا بحکمِ امامؑ تنِ تنہا جا کر فوجِ مخالف سے آمادگیٔ جنگ کا سبب پوچھنا۔ وہ امامؑ کا عبادتِ الٰہی کے لئے ایک شب کی مُہلت مانگنا اور وہ اُسی شبِ عاشورا کو حسینؑ کا شمع گُل کر کے اپنے فدائیوں کو چلے جانے کا مشورہ دینا مگر اُن میں کسی ایک کے پائے ثبات میں جُنبش نہ آنا۔!!

یہ وہی شب تھی جب کسی خیمے میں شجاعت کے سکّے دلوں پر بٹھانے کے لئے ہتھیاروں پر صیقل ہو رہی تھی اور کسی میں رضائے الٰہی کی سند حاصل کرنے کے لئے تسبیح و تہلیل۔ کسی خیمے میں فداکاری کا جذبہ پیدا کیا جا رہا تھا اور کسی میں اگلے روز نذرِ اسلام کرنے کے لئے کوئی ہدیہ نہ ہونے پر آہ و زاری۔ کہیں بچّوں کے جاہ و منصب پا لینے کے مرحلوں کو سعادتِ شہادت حاصل کرنے کے ولولوں میں تبدیل کرنے کے لئے فصاحت و بلاغت کے چشمے اُبل رہے تھے اور کہیں یہ سُن کر کہ بنتِ زہراؑ کو اُن پر اعتماد نہیں جاں نثارانِ حسینؑ تلواروں کے نیاموں کو آگ میں جھونک کر برہنہ تلواریں لئے کربلا کی شہزادی سے مطالبہ کر رہے تھے "وفاداری کی سند دیجئے یا یہ اجازت کہ ہم اپنے گلے اپنے ہی ہاتھوں سے کاٹ کر مر رہیں"!!

بہرحال یہ ہولناک شب، یہ ڈراونی شب، یہ زہرہ گداز شب، یہ روح افزا شب، یہ بے مثل و عدیل شب گزر گئی اور وہ انقلاب

در آغوش روزِ عاشورا نمودار ہوا جس کا آفتاب نکلا تو تکبیر و تسبیح کی دل آویز صداؤں میں مگر ڈوبا نالہ و شیون کی دلگداز آوازوں میں۔ علی اکبرؑ نے اذان دی، مکبّر نے تکبیر کہی، فدائیوں نے صفیں باندھیں اور حسینؑ اور انصارِ حسینؑ نے اُسی طرح فریضۂ صبح ادا کیا جس طرح وہ منزلِ امن و سکون میں ادا کرتے۔ ظہر تک ناصرانِ حسینؑ نے بے جگری، دینداری اور وفاداری کے وہ وہ مظاہرے کیئے اور فوجِ یزیدؔ نے بزدلی، بے دینی اور دُنیا داری کے وہ وہ نمونے پیش کیئے جو چشمِ فلک نے کبھی دیکھے نہ تھے اور یہ مظاہرہ تو فقید المثال ہے کہ حسینؑ کی اجازت اور آپ کی بیچارگی اور کم لشکری کے باوجود آپ کو چھوڑ کر ایک نہ گیا۔ مگر یزیدؔ کی قوّت و طاقت اور اُس کی دولت و ثروت کو ٹھکرا کر بہتیرے اُدھر سے حسینؑ کی طرف کھُلے خزانے آگئے۔ پھر تو جنگ کی وہ گھما گھمی رہی کہ پناہ بخدا! مگر اس عالم میں بھی نمازِ ظہر ادا کی گئی۔ نماز کے وقت لشکرِ اسلام کم تعداد میں ہونے پر بھی بھرا بھرا سا تو تھا۔ مگر عصر کے وقت یکسر خالی۔ صبح کو زہیر ابن قین بھی تھے اور حبیب ابنِ مظاہر بھی۔ مسلم ابنِ عوسجہ بھی تھے اور نافع ابنِ ہلال بھی۔ عون و محمد بھی تھے اور پسرانِ مسلم بھی۔ غرض سبھی تھے۔ اور شام کو دیکھئے تو چھ مہینے کا علی اصغر بھی باپ کی گود میں تیرِ ستم کھا کر ایک معصوم مسکراہٹ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے سو گیا تھا مگر حسینؑ تو تھے۔ اور اُن کا وجود اہلبیت اطہارؑ کے لیئے ایک بڑا سہارا تھا، بہت بڑا سہارا۔ زینبؑ مطمئن تھیں کہ حسینؑ کے

جیتے جی اہلِحرم محفوظ ہیں، سکینہؑ زیادہ سراسیمہ و پریشان نہ تھیں کہ چچا نہیں باپ تو موجود ہے، لیلیٰ اور رباب راہِ خدا میں سب کچھ قربان کر دینے کے بعد بھی سمجھتی تھیں وارث نہ سہی والی تو سر پر ہے، اور فضہ پُرامید تھیں کہ گود کا پالا اور پیری کا سہارا تو باقی ہے۔ لیکن جب امام حسینؑ رخصتِ آخر کے لئے خیمے میں تشریف لائے تو ہر آس ٹوٹ گئی اور یہ آخری سہارا بھی جاتا رہا۔ پھر تو ایک بیمار اور اُسی بیمار کے ایک ننھے فرزند، محمد باقر علیہ السلام، کے علاوہ مردوں میں کوئی باقی نہ رہ گیا۔ اب کیا تھا۔ پہلے شہدا کی لاشیں پامال کی گئیں اور پھر گھوڑوں کی لگامیں خیامِ اہلبیتؑ کی طرف پھیر دی گئیں۔

زرا یہ گردشِ روزگار تو دیکھئے کہ ابھی کربلا میں اِن کے داخلے کو پورا ایک عشرہ بھی نہ ہوا تھا کہ زمین و آسمان بدل گئے۔ آسمان اتنی دُوری پر ہوتے ہوئے بھی بارانِ ظلم کی شدّت کے اعتبار سے گویا زمین کے قریب آ گیا تھا اور زمین پاؤں کے نیچے ہوتے ہوئے بھی منزلوں دور۔ غربت اور مسافرت تو خیر ورودِ کربلا کے وقت بھی شریکِ حال تھی اور اب بھی۔ لیکن اُس وقت اِس زمین پر ترک و احتشام سے نہ سہی عزّت و احترام سے تو اُترے تھے۔ عباسِ علیؑ نے پردے کا اہتمام کیا ہو گا۔ پسرانِ عقیل نے عماریوں کو بٹھایا ہو گا۔ علی اکبرؑ نے بازو تھام کر بی بیوں کو اُتارا ہو گا۔ لیکن آج تو یہ اپنے پیاروں، لاڈلوں، گود کے پالوں اور اپنے سرتاجوں کو ارضِ نینویٰ کے

حوالے کرکے نامعلوم مقام اور اجنبی راہوں کی طرف قیدی بنے کھنچے چلے جارہے تھے۔ نہ کجاوہ تھا نہ عماری، نہ پردہ تھا نہ سواری، نہ قاسمؑ تھے نہ علی اکبرؑ۔ نہ عباسؑ تھے نہ عونؑ و محمدؑ، بس ایک سیلِ انقلاب تھا جو تمام انسانی قدروں کو اپنی رَو میں بہائے لئے جارہا تھا۔ حتیٰ کہ مقتولین کی لاشیں بھی بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں!!

حرمِ رسولؐ کا یہ لُٹا ہوا قافلہ بلاؤں پر بلائیں اور مصیبتوں پر مصیبتیں جھیلتا ہوا کہاں کہاں سے گزرا، کس کس مقام پر ٹھیرا، اور کربلا سے کوفے اور پھر کوفے سے دمشق کس تباہی و بربادی کے عالم میں پہنچا، بازاروں میں کیونکر پھرایا گیا۔ درباروں میں کس کس عنوان سے لایا گیا، قید و بند کا زمانہ کب ختم ہوا، کب رہائی ملی، کس طرح اور کتنے دنوں کے بعد مدینے پہنچا یہ سب ایک طویل افسانۂ اندوہ و الم ہے نہ سُن سکنے اور نہ سنائے جاسکنے کا۔ مگر یہ اندھیر کیا کم روح فرسا تھا کہ وہ کوفہ جو کبھی حضرت علیؑ کا دارالخلافہ تھا۔ جہاں خود جنابِ زینبؑ کا گھر مرجعِ مساکین و اہلِ حاجت تھا اُسی کے بازاروں میں آج علیؑ کی بیٹی زینبؑ تھی اور تماشائیوں کا ہجوم!! ایسے محل پر ہوش و حواس کو قائم اور اپنے کو قابو میں رکھنا بھی ایک بڑا کارنامہ ہوتا۔ چہ جائیکہ مخالف مجمع کو مخاطب کرنے کا حوصلہ اور محل شناسی و باحواسی کا مظاہرہ!!

مگر اللہ رے بنتِ حیدرؑ کا رعب و جلال اور دخترِ زہراؑ کا سکون و اطمینان کہ تقریر شروع کرتے وقت ہاتھ کے پُر وقار اشارے پر دف دینے کی

آوازیں رُک گئیں، تماشائیوں کی سانسوں کی آمد و شد بند ہو گئی اور سننے والے بے اختیار رونے لگے۔ اِس موقع پر فاطمہؑ کی بیٹی حسینؑ کی بہن نے محل شناسی اور باحواسی کی جو مثال قائم کی اور جس طرح حق کی تبلیغ کی اُس کی نظیر ملنا محال ہے ——— نظیر ہے۔ لیکن اِسی مخدرۂ علیا کے اُن خطبوں میں جو ابنِ زیاد اور یزیدلعں کے درباروں میں زبانِ حقیقت ترجمان پہ جاری ہوئے ——— بازارِ کوفہ میں حضرتِ زینبؑ نے جو خطبہ فرمایا اُس میں مجاہدانہ شان بھی تھی اور مبلغانہ شکوہ بھی، روانی بھی تھی اور زور بھی، سلاست بھی تھی اور فصاحت بھی، دلیری بھی تھی اور تمکین بھی آہِ جگر خراش بھی تھی اور تنبیہ حق کوش بھی!!

"اے کوفیو! اے مکّارو! سنو۔ اب کیا رو رہے ہو۔ رُوؤ۔ جی بھر کے رُوؤ۔ ہمیشہ عذاب میں رہو گے۔ تم یہ دھبّہ اپنے دامن سے نہیں دھو سکتے۔ سمجھتے ہو کہ تم نے کسے قتل کیا ہے؟ کس کا خون بہایا ہے اور رسولؐ کے کس لختِ جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے؟ تم نے اُسے قتل کیا ہے جو سردارِ جوانانِ جنّت تھا اور تمھارے لئے منارۂ راہ اور شمعِ ہدایت! اس پر تعجّب نہ کرو کہ آسمان سے خون برسا۔ ڈرو عذابِ آخرت سے جو اِس سے بھی زیادہ عظیم ہے وہ تو تمھیں اور بھی رسوا کرے گا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں تم اُس عذاب کے مستحق نہ ہو جو اہلِ اِرَم پہ نازل ہوا تھا۔ تاخیرِ عذاب کی وجہ سے اپنی بد اعمالی کو سُبک نہ سمجھو۔ اے گروہ بدبخت و بدنصیب!!

جو دم گزرتا ہے قدرت کی ڈھیل اُس کو سمجھ
کمالِ قہر و غضب کی دلیل اُس کو سمجھ
پناہ مانگ یہ فرصت کی وہ درازی ہے
جو کارِ آخرِ تنبیہ بے نیازی ہے
(ماتی جائسی)

بازارِ کوفہ سے مظلوموں کا یہ قافلہ کشاں کشاں دربارِ ابن زیادؑ میں اِس شان سے لے جایا گیا کہ آگے آگے نیزوں پر شہداء کے سر تھے اور پیچھے پیچھے اہلبیتِ رسولؐ۔ اس دلدوز منظر کا تصور کتنا بھیانک ہے کہ ایک طرف تو یہ ستم رسیدہ اہلبیتِ نبوی رسّیوں میں بندھے کھڑے ہیں اور دوسری طرف ابنِ زیادؑ فتح و کامرانی کے نشے میں چور اعیان و عمّال سلطنت کے ساتھ بیٹھا ہوا مصروفِ شادمانی!! اِدھر علیؑ کی بیٹیاں کنیزوں کی شکل میں بالوں سے منہ چھپائے کُنبے کی دوسری بیبیوں کے جُھرمٹ میں اور اُدھر ابنِ مرجانہ گناہوں کا سیاہ غازہ چہرے پر ملے درباریوں کے جمگھٹ میں!! یہ تو قید و بند میں بھی مطمئن اور راضی برضا تھیں مگر اُس کا ضمیر باوصفِ اقتدار و جبروت غیر مطمئن۔ منتقم حقیقی کے غضبِ انتقام سے غافل، پندارِ حکومت میں سرمست مرجانہ کا بیٹا امامؑ کے لب و دندان سے بے ادبی کر رہا تھا اور اہلبیتؑ سے طعن و تشنیع کے لہجے میں مخاطب تھا۔ لیکن یہ سرمستیٔ پندار اور گستاخی مجروح ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ صحابیٔ رسولؐ زید بن ارقم نے سرِ دربار ٹوک دیا۔ "ابن زیاد! کیا کر رہا ہے۔ ارے یہ وہی لب و دنداں ہیں جنھیں رسولؐ بوسے دیتے تھے"

اور دربار سے نکل کر فرمایا۔" لوگو! آج سے تم انسانوں کے غلام ہوگئے۔" رسولؐ کی نواسی نے یوں تنبیہ فرمائی" میں نے تو الحمدُ لِلّٰہ اچھا ہی اچھا دیکھا۔ تجھے البتہ حشر میں معلوم ہو جائے گا کہ کامیاب کون ہوا۔" سیدِ سجادؑ نے فرمایا" ہاں۔ میرے ایک اور بھائی علیؑ تھے مگر اُن کو خدا نے نہیں لوگوں نے قتل کر دیا۔ البتہ اِس اعتبار سے تیرا قول کہ اُنھیں اللہ نے قتل کیا درست ہو سکتا ہے کہ روحِ انسانی اللہ ہی کے حکم سے قبض ہوتی ہے۔" یہ جرأت و ہمت اور یہ بیباکی و حق گوئی ابنِ زیاد کی قوتِ اِستبداد کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس نے حکم دیا" اِنھیں قتل کردو" بس یہ سننا تھا کہ زینبؑ دوڑ کر بھتیجے سے لپٹ گئیں اور فرمایا" تو مجھے بھی اِن کے ساتھ قتل کرا دے۔" سیدِ سجادؑ نے کہا" پھوپھی! مجھے چھوڑ دیجئے۔ اِس کا جواب دینے دیجئے۔" پھر امامؑ نے ابنِ زیادؒ سے خطاب کر کے فرمایا" تو مجھے موت سے ڈراتا ہے؟ تجھے نہیں معلوم کہ قتل کیا جانا ہماری قسمت ہے اور شہادت ہماری سعادت ہے!!" اِسی طرح مسجد کوفہ میں ابن زیادؒ کی بدتمیزیوں اور زبان درازیوں پہ ایک نابینا بوڑھے بشیر؟ عبداللہ ابن عفیفؒ نے للکار کر کہا" او! مرجانہ کے بیٹے!! تو جھوٹا اور تیرا باپ جھوٹا اور وہ بھی جھوٹا جس نے تجھ کو حاکم بنایا۔ ایک تو فرزندِ رسولؐ کو تو نے قتل کیا اور اب طعن و تشنیع کے نشتر اُن کے عزیزوں کے دلوں میں چبھوتا ہے۔" یہ حرفِ حق سُن کر ابنِ زیاد آگ بگولا ہو گیا۔ پوچھا

"یہ گستاخ کون ہے؟" جناب عبداللہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا "میں ہوں عبداللہ ابن عفیف"۔ اس جواب سے ابن زیاد اور بھی نعل در آتش ہوا اور حکم دیا کہ ان کو گرفتار کر لیا جائے۔

عبداللہ ابن عفیف آلِ رسولؐ کی طرح بے یار و مددگار تو تھے نہیں کہ بس ابن زیادؔ کی جنبشِ لب پر گرفتار کر لئے جاتے۔ آپ کے قبیلۂ یزد کے لوگ آپ کو مسجد سے نکال لے گئے اور بعافیت گھر پہنچا دیا۔ بظاہر بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ مگر استبداد، جرأت، ہمت کے، اس دلیرانہ اقدام کو بھلا کیونکر انگیز کر سکتا اور باطل اس حق گوئی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اپنی ندامت کو مٹانے، عوام پر اپنا رعب بٹھانے اور حق گوئی اور آزاد گفتاری کی سزا دینے کے لئے ابن زیادؔ نے فوج کا ایک دستہ بھیجا کہ عبداللہ ابن عفیف کو گرفتار کر لائے۔ عبداللہ کے قبیلے والوں کو خبر ہوئی تو وہ اُن کی حمایت میں تلواریں سونت کر آ پہنچے اور فوجی دستے کو واپس جانا پڑا۔ اب کی ایک اور بڑا دستہ بھیجا گیا۔ جس نے عبداللہ کے حمایتیوں کو شکست دے کر مکان کا محاصرہ کر لیا۔ گھر میں صرف ایک صاحبزادی تھیں۔ آپ شمشیر بکف باہر نکلے تو یہ صاحبزادی کوٹھے پر چڑھ گئیں اور وہاں سے باپ کو بتا دیتی اور بتاتی جاتی تھیں کہ "بابا۔ دشمن اب داہنے پر ہے۔ اب بائیں پر۔ اب سامنے ہے اور اب پیچھے"۔ عبداللہ ابن عفیف اپنی باہمت صاحبزادی کی آواز پر تلوار چلاتے اور مخالفوں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے

بیسیوں مشرکوں کو فی النار کیا اور بعد کو خود شہید کر دیئے گئے۔ شمشیر زنی کے ساتھ ساتھ آپ فرماتے جاتے تھے "میں تو اپنی بینائی کھو دینے کے بعد کف افسوس ملا کرتا تھا کہ اب مجھے جہاد کا موقع کاہے کو ملے گا اور شہادت کا شرف بھلا کیا نصیب ہو گا۔ لیکن شکر ہے کہ آج حمایت حق میں جاں نثاری کا یہ موقع مجھے مل گیا اور یہ سعادت مجھے نصیب ہو گئی"!!

طنطنہ و جرأت اور حق گوئی و راست بازی کے ان مظاہروں کے سامنے ثروت و دولت کی قوت، ابن زیاد کا پندار اور یزید لعین کی فرعونیت دم بخود اور سر در گریباں تھی۔ اور شیطنت و عدوان کے مقابلے میں حسینیت و انصاف سر بلند۔ اور اب دنیائے انسانیت جس کا کلمہ پڑھتی ہے وہ حسین ہیں اور بس ؎

آں امامِ عاشقاں پورِ بتول ۔۔۔ سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ

تا قیامت قطعِ استبداد کرد ۔۔۔ موجِ خونِ اُو چمن ایجاد کرد

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت ۔۔۔ سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز ۔۔۔ تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

اے صبا! اے پیکِ دور افتادگاں ۔۔۔ اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں!!

(علامہ سر اقبال)

۹

کوفے سے شام تک کی انقلاب انگیز مسافرت!!

جب دنیوی رعب و داب کی تمدّق بھڑک اور مادّی جاہ و جلال کی چمک دمک نگاہوں میں اِس طرح کھُب جائے کہ دماغ سے تفکّر کی صلاحیت، دل سے احساس کی اہلیت اور زبان سے اظہار کی جرأت یک لخت محو ہو جائے اور اِس ضیاعِ عظیم کا حِسّ تک باقی نہ رہے تو پھر ظلم و عدوان اور نا انصافیوں کے لئے میدان صاف ہو جاتا ہے اور ظالموں کے کھُل کھیلنے کے لئے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں شرّ آفرینیوں کی حدوں کو مقرر کرنا اور ظلم رانیوں کی سنگینیوں کا احصاء کرنا آسان نہیں، بڑا مشکل کام ہے۔ اِس خروش کے عالم میں تو خود ظالم پہ بھی کچھ ایسی محویّت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ بھولے سے بھی یہ نہیں سوچتا کہ ظلم ہی انقلاب کی پرورش گاہ بھی ہوتا ہے اور مظلوم کی آہ آماجگاہ بھی۔ ایسے میں تو بس خود اپنے لئے بیش از بیش مادّی منفعت حاصل کر لینا اور اپنے آقاؤں کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنا نصب العین ہو جاتا ہے۔ حق کو باطل اور باطل کو حق بنانا، دغا و دغل کو رواج دینا، حق گوئی و راست گفتاری کا گلا گھونٹنا طبیعتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ غرض ناحق کوشی و خدا فراموشی کا ایک عجیب رنگ ہو جاتا ہے۔

اسلامی نظام کی نصفت آئینی اور عاقبت بینی کو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا تھا کہ اہلِ اسلام شاید اِس شاہانہ شان و شوکت اور اِس غلامانہ ذہنیّت کے دام میں نہ پھنسیں اور اِس فتنے سے محفوظ رہ سکیں مگر احتشام اندیش اور ثروت کیش نام نہاد مسلمان رہنماؤں کے ہاتھوں یہ افسوس ناک صورتِ حال یہاں بھی پیش آ کر رہی۔ اور یہ روزِ بد اسلام کو بھی دیکھنا ہی پڑا حتیٰ کہ عام مسلمان رسولؐ کے گھرانے سے قطعاً لاعلم اور اُن کے کارناموں، مجاہدوں اور سرفروشیوں سے تمام تر ناآشنا ہو گئے۔

اِن حالات کی موجودگی اور ایسے ماحول کی طرح اندازی و کارسازی کے بعد ظاہر ہے کہ حسینؑ کے قتل کے نتیجے میں کسی طرح کی بے چینی کے رونما ہو جانے کا گمان بھی نہ ہو سکتا تھا چہ جائیکہ کسی قسم کی "سرکشی" کا!! بلکہ اِس کے برخلاف اہلبیتؑ کو قید کر کے اُن کی بے حرمتی اور اُن کی قریہ بہ قریہ اور شہر بہ شہر تشہیر و رسوائی حصولِ مقصد کے لئے مُضر نہیں مفیدِ مطلب ہی سمجھی جا سکتی تھی کیونکہ اُس کے بغیر نہ تفوق کی پیاس بجھ سکتی تھی اور نہ تفاخر کی ہوس کو سیری ہی نصیب ہو سکتی تھی۔

بہر حال قتلِ حسینؑ کے بعد اُن کے گھرانے کی عورتوں اور بچّوں کو اسیر کر کے دیار بہ دیار اُن کی تشہیر کی گئی اور بالآخر اپنے آقا کا عندیہ پا کر اُس کی خوشنودی کے لئے اِن قیدیوں کا تماشا اپنے یزیدؔ کو بھی دکھانا ابنِ زیادؔ پر گویا لازم ہو گیا۔!!

اُدھر اپنے اقتدار کی نمائش کی غرض سے اِن اسیروں کو شام

لے جانے کے لئے شارعِ عام کا انتخاب کیا گیا۔ حکومت کے جو باجگزار راہ میں پڑتے تھے اُن کے نام احکام جاری کئے گئے کہ شہروں کو آراستہ کریں، راہوں کو سجائیں، نوبتیں بجائیں، خلعتیں پہنیں، عیدیں منائیں اور جی کھول کر یزید کی فتح کا جشن برپا کریں۔ اِس طرح ایک طرف تو عوام کے دلوں میں آزادیٔ ضمیر اور اظہارِ احساس کے پاداش کی دہشت اور زیادہ سما جائے گی اور دوسری طرف اِن اسیرانِ بلا کی اہانت و رسوائی کی شدّت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ خلافتِ یزیدیہ عوام پسندی کی مہرِ تصدیق ثبت کرنے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کا اِس سے بہتر عنوان بظاہر ہو بھی کیا سکتا تھا۔

ہاں تو کربلا کے قیدیوں کو شام لے جانے کے لئے دو نسبتہً چھوٹے راستے چھوڑ کر وہ راستہ اختیار کیا گیا جس کی مسافت دوسرے دو راستوں سے تقریباً دوگنی تھی اور جس پر نہ صرف حکومت کے وفاکیشوں کی آبادی زیادہ تھی۔ بلکہ جو زیادہ سے زیادہ محفوظ بھی تھے۔ اِس طویل مسافت کو اختیار کرنے سے اِن بے وارث قیدیوں کی صعوبتِ سفر اور شدّتِ منازل کتنی بڑھ جائیں گی اس کا بھلا کس کو خیال تھا!!

لے سب سے چھوٹا راستہ تقریباً ۶۰۰ میل کا تھا اِسے یوں اختیار نہ کیا گیا کہ یہ صحرائی راستہ تھا اور اِس میں آبادیاں کم تھیں اور پانی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔

دوسرا راستہ تقریباً ۹۳۲ میل کا تھا۔ اِس پر بستیاں تو بکثرت تھیں مگر اُن میں بیشتر

(باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

غرض دجلے کے کنارے کنارے چودہ سو میل کی اِس مسافت میں کم و بیش بیس[5] منزلیں طے کرنا پڑیں تب کہیں یہ قافلہ "شام" پہنچا، اِس حالِ تباہ سے کہ آگے آگے شہدا کے سر اور پیچھے پیچھے ستمزدانِ بے کجاوہ و عماری پر اہلِ حرم۔ آہ! آہ! اپنے پیاروں، عزیزوں، قرابتداروں اور جاں نثاروں کے سروں کے ہمہ وقت پیش نظر رہنے سے اِن بے وارثوں اور غریب الوطنوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی!! مگر اللہ رے صبر و استقلال کہ ایک حرفِ شکوہ و شکایت زبان پر نہ آیا اور شانِ مظلومی میں کسی عنوان سے کوئی کمی نہ ہوئی۔ اور زرا ان صداؤں کو تو سُنئے جو حکومت کے اشاروں پر پیہم بلند ہو رہی ہیں "ھذہ السبایا مِن بَنَاتِ محمدٍ" اور یہ بجائے خود اُن اسیروں کی نجابت و شرافت کا وہ اعلان تھا جو دشمنوں کی معرفت ہو رہا تھا۔ اُس پر مستزاد یہ کہ اکثر منزلوں پر عوام کی طرف سے ظالموں کی مخالفت اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱)

مُحبانِ اہلبیتؑ کی آبادی تھی۔

[۴] یہ راستہ آباد بھی تھا اور بارونق بھی۔ اور اس میں اوّل الذکر دونوں راستوں کی سی صعوبتیں اور مشکلیں بھی نہ تھیں پھر تشہیرِ اہلبیتؑ کی شدت کا امکان بھی بہت زیادہ تھا اس کی مسافت تقریباً چودہ سو میل تھی۔

[۵] (۱) قادسیہ۔ (۲) بغداد۔ (۳) تکریت۔ (۴) موصل۔ (۵) سنجار۔ (۶) نصیبین۔ (۷) عین وردہ۔ (۸) حمدان۔ (۹) راس عین۔ (۱۰) کلیسہ۔ (۱۱) حلب۔ (۱۲) قنسرین۔ (۱۳) معرۃ النعمان۔ (۱۴) شیرز۔ (۱۵) کفرتاب۔ (۱۶) حماہ۔ (۱۷) حمص۔ (۱۸) بعلبک۔ (۱۹) عسقلان۔ (۲۰) شام۔

اسیروں کو اپنے شہر کے اندر لانے کی ممانعت اور وہ مزاحمت جس کا ظالموں کو سان گمان تک نہ تھا!!

پھر اِس مخالفت اور مزاحمت میں مسلمان ہی نہیں یہودی اور نصرانی بھی پیش پیش تھے۔ مثلاً منزلِ تکریت پر جہاں کے حاکم نے جھنڈا لہرانے، بگل بجانے اور شہر کو آراستہ کرنے کا حکم اِس یقین دہانی کے ساتھ دیا تھا کہ، معاذاللہ، ایک خارجی نے خلیفہ وقت پر خروج کیا تھا اُسی کا سر کاٹ کر ابن زیاد حاکمِ شام کے پاس بھیج رہا ہے۔ ایک نصرانی نے بتایا "لوگو! یہ سر حسینؑ کا ہے" یہ سُن کر نصرانی اپنے کنیسوں سے نکل پڑے اور اُس قوم کے خلاف جس نے خود ہی اپنے نبی کے نواسے کو قتل کر دیا اپنی بیزاری کا ایسا پُر قوت مُظاہرہ کیا کہ ظالموں کو شہر میں جانے کی ہمّت نہ ہوئی اور جب یہ قافلہ حلب سے گزرا تو تمام اہلِ حلب امام کے سرِ مُبارک کی زیارت کو نکل پڑے اور ظالموں پر لعنت کرنے لگے۔ ظالموں کو اپنے شہر سے نکال دیا!!

موصل میں بھی وہی تکریت کا ایسا سامانِ جشن مہیّا اور شہر آراستہ کیا گیا تھا اور وہی کسی خارجی کے سر کو یزید کے پاس بھیجے جانے کا بہ شدّ و مدّ اعلان ہوا تھا مگر اہلِ موصل ہی میں سے کسی نے کہا "بھائیو! یہ سر حسینؑ کا ہے" اور جب یہ معلوم ہوا تو وہ لڑنے مرنے اور سرِ حسینؑ کو حاصل کرنے پر آمادہ ہو گئے مگر اشقیا کو اُن کے ارادے کی اطلاع مل گئی اُنھوں نے شہر کا رُخ ہی نہ کیا، راستہ بدل دیا!!

حرّان میں ایک یہودی نے اہلبیتؑ کی حالت سے متاثر ہو کر کلمۂ شہادت پڑھا اور بالآخر حمایت اہلبیتؑ میں شہید ہو گیا!!

قنسرین میں اہل شہر کو علم ہوا تو شہر پناہ کا دروازہ بند کر لیا اور ظالموں کو شہر میں قدم نہ رکھنے دیا۔ شیرز کے رہنے والے بھی جانوں پر کھیل کر سر بکف نکل آئے اور اپنے شہر میں ظالموں کو دھنسنے نہ دیا۔

قلعۂ کفر تاب میں بھی لوگوں نے شہر پناہ کا دروازہ بند کر لیا اور قسم کھائی کہ حسینؑ پر پانی بند کرنے والوں کو ایک قطرہ پانی نہ دیں گے۔

سیبور کے جوانوں نے پُل کو توڑ دیا تلواریں سونت کر نکل پڑے، اور گھمسان کا رن پڑ گیا۔ حماۃ میں بھی شہر والوں نے شہر میں گھُسنے نہ دیا۔

حمص میں بھی یہی ہوا اور شہر میں داخلہ ممکن نہ ہو سکا!!

اسیرانِ بلا کی کامل خاموشی کے بعد بھی یزیدؔ کے شاہانہ طنطنوں کے مقابلے میں اس قسم کی مزاحمتیں اور مخالفتیں اہلِ فکر و نظر کے لئے ایک بڑا سرمایۂ غور و فکر تو خیر ہیں ہی لیکن یہ باتیں اُن کی حقّانیت کا ثبوت اور اُن کی مظلومیت کی گواہ بلکہ فتحِ حق کی ایک روشن نشانی بھی ہیں۔

اور قدرتِ کاملہ کی کمال کارسازی و کارفرمائی کی اس تاریخی حقیقت کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہیں کہ بالآخر ظلم کا سر نیچا ہوتا ہے اور انقلاب مظالم کے تناسب کے ساتھ رُونما ہوتا ہے۔ یہ درسِ عبرت بھی ملتا ہے کہ اللہ کا حکم، قہر و غلبہ اور قوّت و جبروت کو فنا کے گھاٹ اُتار کر بڑے بڑے کرّ و فر والے شاہوں اور شہنشاہوں تک کے تاج و تخت کو

تباہ و برباد کر دیتا ہے!!

بہر حال یہاں تو یہ عالم تھا کہ آئینہ بندی و آرائش کی دلکشیوں، فتح کے باجوں اور شادیانوں کی صداؤں، چنگ و رباب کی دلفریبیوں اور دف و نے کی سامعہ نوازیوں اور لباسِ فاخرہ میں ملبوس عامیوں کے اژدحام میں مسلمانوں کے نبی کے اہلبیت کا تباہ حال قافلہ جو صبح سویرے حدودِ شہر میں داخل ہوا تھا وہ کہیں سرِ شام دربار تک پہنچ سکا!!

جب یہ قافلہ بازار سے گزر رہا تھا طلحہ کے بیٹے ابراہیم نے سیّد سجادؑ سے پوچھا "فرزند حسینؑ! فتح کس کی ہوئی؟" آپ نے کہا "جب اذان کی آواز سننا اور نماز پڑھنا تو سمجھ لینا کہ فتح کس کی ہوئی"۔

اور جب یہ قافلہ مسجدِ جامع کے قریب پہنچا تو ایک شخص نے یہ سمجھ کر کہ یہ اسیرانِ کفار ہیں ان کی تذلیل پر شکرِ خدا ادا کیا۔ سیّد سجادؑ نے اُس پیر مرد سے دریافت فرمایا "تو نے قرآن بھی پڑھا ہے؟ کیا ذوی القُربیٰ کی محبت مسلمانوں پر فرض نہیں کی گئی؟ کیا اُس کو اجرِ رسالت قرار نہیں دیا گیا؟ کیا مسلمانوں کے مال میں ذوی القربیٰ کا پانچواں حصّہ معین نہیں کیا گیا؟ اور کیا خدا نے اُن کو بُرائی سے پاک نہیں رکھا؟" اُس نے جواب دیا "بیشک ایسا ہی ہے"۔ آپ نے فرمایا "وہ ذوی القُربیٰ ہمیں تو ہیں۔ خدا کی قسم! وہ ہمیں ہیں"۔

اب تو وہ توبہ و استغفار کرنے اور دشمنانِ اہلبیتؑ سے اپنی برائت کا اعلان کرنے لگا۔ امامؑ سے پوچھا "کیا میری توبہ قبول ہوگی؟" آپ نے

فرمایا "بیشک قبول ہوگی، تو فی الاصل ہمیں میں سے ہے"۔ یزید کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے اُس مردِ حق گو کو قتل کرا دیا۔ تو یہ قبول ہوگئی، امامؑ کا قول سچا ہو گیا!!

گو یہاں بہیمیت کی سنگینی اور شیطنت کی کارستانی کا اجمالی تذکرہ بھی مقصود نہیں مگر اتنا تو بہر حال کہنا ہی ہے کہ از کوفہ تا شام غربت کی یہ مسافت ایک بڑی تبدیلی اور ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ بن گئی۔ پیغمبرؐ سے اپنا قرض وصول کر لینے، اُن کے خلاف اپنے بغض و عناد کو بروئے کار لانے، مظلوموں کی تحقیر و تذلیل کرنے، مقتولوں کا تماشا دیکھنے اور فخر و مباہات کرنے کے منصوبے، دلنشۂ کامرانی و سرمستی کے ولولے سب مٹ کر رہ گئے، نیست و نابود ہو گئے ـــ مٹ کیسے نہ جاتے جب حق گوئی کا حوصلہ اور راست بازی کا طنطنہ قدم قدم پر تبختر و تفاخر کے سر کو جھکاتا اور ذوقِ تماشا کو مجروح کرتا جا رہا تھا۔ دراصل حسینؑ نے اپنے مضبوط کردار سے آدمیت کی عزّت اور عبدیت کے وقار کے نقوش کو دلوں پر ایسا جما دیا تھا اور خود اپنا سر کٹا کر سر بلند رہنے اور باعزّت زندگی بسر کرنے کے ایسے طریقے سکھا دئے تھے کہ اُن سے بہتر کا تصوّر امکان ہی میں نہ رہا۔ انقلاب آفرینی کے لئے حسینؑ کا اسمِ گرامی اور نام نامی ضرب المثل بن گیا۔ حسینؑ اور اسلام مرادف ہو گئے۔ اللہ رے آپ کی شان یا حسینؑ!!

قرۃ العینِ نبیؐ آرامِ جانِ مرتضےٰؑ ۔۔۔ فاطمہؑ کے لختِ دل، بازوئے شاہِ مجتبےٰؑ

سیّد شبّانِ جنت خامسِ آلِ عبا ۔۔۔ تجھ سے ہے آئینۂ توحیدِ باری کی جلا

اے محیّ دینِ حق، محسن ہے تو اسلام کا

مستقل نقشِ نگیں ہے مصطفےٰؐ کے نام کا!! (مانی جائسی)

ماخوذ از منازل آلام مصنّفہ مولانا احسن حسین گوپال پوری مرحوم۔

(۱۰)

زندانِ شام اور دربارِ یزید میں آلِ رسولؐ کی حالت!!

زندان کی لفظ جب ہماری زبان پر آتی ہے تو عموماً قیدیوں کی بیچارگی، بے بسی، تنہائی، پابندی اور عزیزوں اور رفیقوں سے اُن کی جُدائی کی تصویر چشمِ تصوّر کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن آلِ محمدؐ کے قید و بند کے سلسلے میں جب زندانِ شام کا ذکر آتا ہے تو، عام احساسات و جذبات سے الگ، ایک مخصوص کیفیت ہوتی ہے اور بیکسی کا ایک اور ہی عالم پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔ زندان کی تنگی و تاریکی سے قطعِ نظر اُن کی بے گناہی اور اُن پر مظالم کی سنگینی کا یقین دلوں کو خصوصیت کے ساتھ بے چین کر دیتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ساری دُنیا کے مصائب ایک کُنج زندان میں بھر دئے گئے ہوں!!

اِسی طرح دربار کی لفظ سے عام طور پر شان و شکوہ کے جو تاثّرات ذہنوں پر مرتسم ہوتے ہیں وہ اُس دربار کے تاثّرات سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں جہاں عترتِ رسولؐ کی آئے دن پیشی ہوا کرتی تھی۔ اِن بے والی و وارث اور غریب الوطن اسیرانِ خانوادہ رسالت پر ظلم کے تیر و تبر اور

طنز و تعریض کے نشتر جو کیفیت کرب و اضطراب اور ہیجان و اضطرار کی پیدا کرتے ہیں وہ شاہانہ طمطراق اور دربار کی رونق و شان کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتے۔

جہاں تک مظالم کی گرانی اور مصائب کی بے پایانی کا تعلق ہے بازارِ کوفہ اور راہِ شام، دربار ابن زیاد اور دربارِ یزید میں کوئی فرق نہ تھا اور ہر منزل رُوح فرسا اور زہرہ گداز تھی۔ البتہ زندانِ شام اور دربارِ یزید کے ساتھ کچھ ایسے مخصوص حالات وابستہ ہیں جن کی بنا پر یہ دونوں منزلیں اہلبیتِ اطہارؑ کے لئے حد سے زیادہ سخت اور روح فرسا ہوگئی تھیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ جب بیمار امامؑ سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ تکلیف دِہ کون سی جگہ تھی تو کربلا کو نہ بتایا، کوفے کا نام نہ لیا بلکہ تین بار فرمایا "الشّام! الشّام! الشّام!"

کوفے میں علیؑ کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے اہلبیتِ اطہارؑ کی منزلت و عظمت سے باخبر کچھ نہ کچھ لوگ موجود تھے جو اُن کی حمایت کی جرأت تو نہ کرسکتے تھے مگر اُن کی تنبیہ و تہدید اور اُن کے نالہائے دلدوز کو سُن کر آنسو ضرور بہا دیتے تھے اور ابنِ زیاد کو اُن کی حد سے زیادہ توہین پر احتجاج کا اندیشہ بھی رہتا تھا۔ مگر سرزمینِ شام پر تو یہ اسیرانِ رنج و بلا گویا بالکل اجنبی تھے۔ پھر برسوں کی منظّم کوشش و کاوش کے نتیجے میں صرف اِتنا ہی نہیں تھا کہ اجنبیّت حائل تھی بلکہ نفرت کے جذبات بھی اِن کے خلاف کارفرما تھے۔ وہاں ابنِ زیاد یزید کے ایک نمایندے کی حیثیت سے برسرِ کار تھا اور یہاں خود یزید اپنی شہنشاہیّت کے پورے رعب و داب

اور جاہ وجلال کے ساتھ اُن اسیرانِ بلا کی آنکھوں کے سامنے تختِ شاہی پر متمکن، وہاں محض ذاتی اہانت سے سابقہ تھا اور یہاں اُس کے ساتھ ہی وحیِ الٰہی کی تکذیب کا مقابلہ، وہاں کنیزوں کی صورت میں بازاروں میں پھرائے جانے پر اکتفا تھی اور یہاں واقعی کنیز بنائے جانے کی تجویز، وہاں جو کچھ کیا گیا ایک حکم کے سہارے سے کیا گیا اور یہاں خود حاکم کا حکم نافذ تھا، وہاں صرف قتل واسیری کا اشتہار مقصود تھا یہاں توہینِ حسینؑ اور تکذیبِ خاندانِ رسالت مطلوب، وہاں صرف عرب کے لوگ تھے یہاں غیر ممالک کے سفراء بھی۔ غرض شام کی صورتِ حال کوفے کی حالت سے بہت زیادہ پُرہول، جانگداز، دل سوز اور عبرتناک تھی۔

اگر شداید ومصائب کے اعتبار سے خود زندانِ شام اور دربارِ یزید کا موازنہ کیا جائے تو دن کی دھوپ اور رات کی اوس کے باوجود زندان فی الجملہ جائے امن تھا اور دربار کا تزک واحتشام صاعقہ بردوش۔ زندان میں ان ستم زدوں اور زمانے کی ستائی بی بیوں کے لئے آفتاب کی گرمی کو برداشت کر لینا آسان تھا مگر دربار میں اربابِ حکومت کے آوازوں توازوں کی سختی کا مقابلہ کرنا کربِ موت سے زیادہ شدید تھا۔ یہ غریب قید خانے میں اپنے لاڈلوں، گود کے پالوں، اپنے والیوں اور وارثوں کے زخمِ فراق ہی سے بیقرار رہتے تھے مگر دربار میں تو اُن زخموں پر نمک پاشی بھی کی جاتی تھی۔ بوسہ گاہِ رسولِ مقبول اور سرِ اقدسِ فرزندِ بتولؑ کے ساتھ بے ادبی ہوتے دیکھنا اور ضبط سے کام لینا، یزید کے کافرانہ اور

فاسقانہ سوالات کے جوابات جان سے ہاتھ دھو کر دینا ، بد سے بدتر انجام کے مقابلے کے لئے تیار رہو کر اعلائے کلمۂ حق کرنا ، یزیدؑ کو بھرے دربار میں سب کچھ سُنا کر لاجواب کرتے رہنا ، نامحرموں کے رو برو پردہ داری کی تا حدِّ امکان سعی کرنا۔ غرض ایک مصیبت ہو تو اُس کا ذکر کیا جائے ، ایک بلا ہو تو احاطۂ بیان میں لائی جائے۔ کوئی لمحہ اطمینانِ قلب کا حاصل نہ تھا ، ہر لحظہ ایک نئے فتنے اور خدشے کا پیش خیمہ تھا۔ ایک مرتبہ قتل ہونا آسان ہے مگر زندہ رہ کر ذمہ دار محافظانِ شریعت کا ہر آن قتل کی دھمکیاں سننا اور اسیری کی حالت میں بھی اپنی ذمّہ داریوں کو محسوس کر کے کلمۂ حق زبان پر جاری رکھنا مشکل ہی نہیں ، سخت مشکل ہے۔

مگر بلاؤں کے پیہم نزول کے باوجود اِن مقدّس و محترم خواتین نے اِس سخت منزل پر مجاہدۂ نفس اور جہاد باللسان کی گویا حدیں قائم کر دیں۔ مجاہدۂ نفس ایسے ایسے موقعوں پر کیا کہ اس محل پر اپنے تو اپنے غیر تک چیخ اُٹھے اور تابِ ضبط نہ لا سکے۔ سرِ حسینؑ کی اہانت پر ابو برزۂ اسلمی اور قیصرِ روم کے سفیر تک بلبلا گئے مگر اللہ رے بنتِ زہراؑ کا ضبط کہ آپ نے اُف تک نہ کی۔ بہر حال صورتِ حال حد درجہ المناک تھی مگر اہلبیتِ حسینؑ مجاہدۂ نفس کی ایسی مشکل منزل سے بھی بآسانی گزر گئے اور جہاد باللسان کی تو ایسی ایسی مثالیں پیش فرمائیں کہ دنیا آج تک محوِ حیرت ہے۔ مورخینِ عالم حیران ہیں کہ یزیدؑ کے علی الرّغم اُس کی جسارتوں ، بدتمیزیوں اور گستاخیوں کا پرقوتِ اور باطل شکن جواب دینے کا ایسا حوصلہ بے یار و مددگار اسیروں میں

آیا کیسے - اور غیرت وحمیّت کو بیکسی کی موت مرنے سے بچانے کا ایسا طنطنہ پیدا ہوا تو کیونکر!!

ایسے متعدد موقعوں میں سے ایک موقع وہ تھا جب ایک شامی نے فاطمہ بنت الحسینؑ کی طرف اشارہ کر کے یزیدؑ سے کہا "یہ لڑکی مجھے دی جائے"، شہزادی یہ کلام سُن کر لرزنے لگی اور پھوپھی سے لپٹ گئی۔ جنابِ زینبؑ نے بھتیجی کو تسکین دی اور اُس شامی کو ڈانٹ کر کہا۔ "اگر تو مر جائے تو بھی یہ نہیں ہو سکتا"!!

غیرت وحمیّت پر یہ کاری ضرب جو دربارِ یزیدؑ میں اُس شامی نے لگائی تھی کیا زندانِ شام میں سکینہؑ کی وفات سے کچھ کم ہوش رُبا اور جرأت آزما تھی۔ لیکن حسینؑ کے اہلِ حرم نے اِسے بھی جھیلا اور اُسے بھی!!

جہاد باللّسان کی وہ مثال بھی بے نظیر ہے جب جنابِ زینبؑ نے یزیدؑ کے نخوت وغرور کے پرخچے اُڑا دیئے اور خود یزیدؑ کو مخاطب کر کے وہ معرکہ آرا اور فصیح وبلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جسے فنِ خطابت کا شاہکار کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اِسی طرح خواہرِ حسینؑ جنابِ اُمّ کلثوم اور بیمار امامِ زمانہ نے بھی اہم، لیکن نہایت خطرناک موقعوں پر، جہاد باللّسان فرمایا ہے اور فصیح و بلیغ اور مؤثر خطبے ارشاد فرمائے ہیں جن میں مناسبتِ محل کے اعتبار سے جوش وخروش بھی تھا اور ایمان فروشوں پر لعن وطعن بھی، متانت کی سادگی بھی تھی اور تمکین ووقار کی دل آویزی بھی، شکوۂ الفاظ بھی تھا اور شانِ تبلیغ بھی، زور بھی تھا اور روانی بھی، آیاتِ قرآنی بھی تھیں، اور احادیثِ نبوی بھی۔

انھیں نازک موقعوں میں سے ایک محل وہ بھی تھا جب ایک روز یزیدؔ نے ایک خطیب کو حکم دیا کہ وہ اُس کے مناقب اور آلِ رسولؐ کے مثالب بیان کرے۔ اِس حکم کی تعمیل کے بعد امامِ بیمار، سیّد سجادؑ نے یزیدؔ سے فرمایا "کیا میں بھی کچھ بیان کر سکتا ہوں"۔ حاضرین کے اصرار و اظہارِ اشتیاق سے مجبور ہو کر امامؑ کو اجازت ملی تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ گو ترجمے میں آبِ کوثر سے دُھلی ہوئی زبان کی اعجاز آفرینی نہ ہوگی اور وہ تقریر آپ کے مشامِ جان کو قرار واقعی کیف نہ بخش سکے گی مگر چشمِ بصیرت کو اخلاص و مودّت کے آنسو بہانے پر تو آمادہ کر ہی دے گی۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

"لوگو! جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے۔ میں حسینؑ کا بیٹا علیؑ ہوں، میں فاطمہؑ کا فرزند ہوں، اُس کا پارۂ جگر ہوں جو مکّے اور منیٰ کا مالک ہے، میں اُس کا لختِ دل ہوں جو صاحبِ صفا و مروہ ہے، میں اُس کا وارث ہوں جس کے ساتھ ملائکہ نے آسمان پر نماز پڑھی، میں اُس کا فرزند ہوں جو حوضِ کوثر کا مالک ہے، میں اُس کا فرزند ہوں جس پر قرآن نازل ہوا، میں اُس کا فرزند ہوں جس نے اپنے عہد کو پورا کیا۔ لوگو! میں خدا کے رسول کا فرزند ہوں، میں اُس کا فرزند ہوں جس کے لئے جنّت کے دروازے کھولے گئے اور جو خوشنودیٔ خدا کی منزل ہے، میں اُس کا فرزند ہوں جو جور و جفا سے قتل کیا گیا، جس کا سر پسِ گردن سے کاٹا گیا، جو پیاسا ذبح کیا گیا،

جو زمینِ کربلا پر بے گور و کفن پڑا رہا اور جس کی بیکسی پر ملائکہ روئے "

" لوگو! خدا نے سخت بلا سے ہمارا امتحان لیا ہے۔ اُس نے ہمارے لئے ہدایت کو مخصوص کیا اور ہمارے دشمنوں کے لئے ہلاکت کو۔ خدا نے ہم کو تمام عالم پر فضیلت دی، اور وہ چیزیں عطا فرمائیں جو دُنیا میں کسی کے پاس نہیں۔ علم، حلم، شجاعت، خدا کی محبّت، اور رسول کی اُلفت۔ یہ پانچ چیزیں ہمیں کو دی گئی ہیں!!

امامِ بیمارؑ یہیں تک پہنچے تھے کہ اہلِ بزم رونے لگے اور یزید کے دل میں اہلِ شام کے منحرف ہو جانے کا خوف پیدا ہوا۔ موذّن کو اشارہ کیا گیا کہ اذان دے۔ اذان شروع ہوئی۔ امامؑ خاموش ہو گئے۔ مگر جب موذن نے کہا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلَ اللّٰہ تو حضرت پھر گویا ہوئے اور فرمایا۔

" اے یزید! تو ہی بتا حضرت محمدِ مصطفےٰؐ میرے جدّ تھے یا تیرے "؟ یزید نے کہا " بے شک وہ آپ ہی کے جدّ تھے "۔ " تو پھر تو ہی بتا کہ تو نے اُن کی ذُرّیّت کو قتل کیوں کیا اور اُن کے اہلبیتؑ کو قید کیوں کیا؟"

یہ سُن کر یزید خاموش ہو گیا اور حاضرینِ مسجد یک زبان ہو کر کہنے لگے

" ہائے! اسلام پر بڑی مصیبت پڑ گئی۔ اسلام تباہ ہو گیا "

اِنہیں مجاہدانہ اقدامات کا اثر تھا کہ دربار اور زندان دونوں کا رنگ بدل گیا یا تو آنکھوں سے آنسو اور لبوں سے آہ تک نہ نکل سکتی تھی یا اب باقاعدہ صفِ ماتم بچھانے کی اجازت دی گئی اور یہ صفِ ماتم

ایک دو روز نہیں سات دن تک برابر بچھی رہی۔ دربار کے خطیبانہ
اندازِ بیان اور زندان کے مظلومانہ اظہارِ خیال نے دمشق کے ایک ایک
گھر کے دیوار و در کو ہلا کر رکھ دیا اور سارے شہر میں ایک کہرام مچ گیا۔
کوئی متنفس ایسا نہ تھا جس نے حسینؑ کا ماتم نہ کیا ہو۔
اور دکھیاری بہن نے مظلوم بھائی کے غم میں واحسیناہ! وامظلوما
واعلیّاہ! واجدّاہ! کی آوازیں بلند کر کے نہ صرف فضائے شام کو تیرہ
و تار بنا دیا بلکہ شامیوں کے سخت دلوں کو بھی ہلا ڈالا۔

داغِ غمِ حسین کی تابندگی نہ پوچھ
ہے دل کی ظلمتوں میں چراغاں کئے ہوئے!! (رمانی جائسی)



(۱۱)

اہلحرم کی وطن کو مراجعت!!

خلشِ پرسشِ محشر تھی مری بے گنہی
نظر آیا مرے قاتل کو خدا میرے بعد!
(مانیؔ جائسی)

دربار میں اہلبیت کی آئے دن کی پیشیوں سے جب یزیدؑ کا دل سیر ہو گیا، خود اُس کے نفس کی ملامت نے جب اُس کی زندگی دشوار کر دی، سطوت و جبروت بے اثر اور بے دست و پا نظر آنے لگے، حسینؑ کا قتلِ ناحق آلودۂ معصیت ضمیر پر بھی گراں گزرنے لگا تو جیسا ظالموں کا عام قاعدہ ہے اپنا الزام دوسروں کے سر تھوپا جانے لگا اور اپنی صفائی کے حیلے سوچے جانے لگے۔ پاداشِ عمل کا تصور کلیجہ برمانے لگا!!

اِسی ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا کہ ایک روز یزیدؑ نے جنابِ سیدِ سجادؑ کو تنہا بُلا بھیجا۔ ہماری شاہزادی زینبؑ خلافِ معمول اِس تنہا طلبی پر بے چین ہو گئیں، طرح طرح کے خیالات ذہن میں گزرنے لگے۔ سوچا ہو گا کہ کیا ہمارے لئے اب اِس بیمار کا دُنیوی سہارا بھی باقی نہ رہنے دیا جائے گا اور کیا بے وارثوں کا یہ لُٹا ہوا قافلہ ایک مردِ نحیف و بیمار کی رفاقت سے بھی محروم کر دیا جائے گا مگر چارۂ کار اور زور ہی

کیا تھا، صبر کے ساتھ بھتیجے کو رخصت کر دیا۔

یزیدؑ نے سید سجادؑ کے ساتھ آج نرم برتاؤ کیا اور کہا۔ "ہم نے آپ لوگوں کو رہا کیا۔ چاہے یہاں دمشق میں قیام فرمایئے یا مدینے واپس جائیے"۔

امامؑ نے ارشاد فرمایا۔ "میں اپنی پھوپھی کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اُن سے دریافت کرلوں تو بتاؤں"۔ آپ قید خانے میں واپس تشریف لائے۔ مضطرب پھوپھی نے بھتیجے کو دیکھا تو بے اختیار کلماتِ شکر زبان پر جاری ہو گئے ——— دربار کی سرگزشت سن کر ارشاد فرمایا "ابھی تو ہمیں کچھ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا ہو اور جی بھر کے رُولیں پھر کچھ کہیں۔ ابھی تو یزیدؑ سے کہو پہلے ہمیں ایک ایسا مکان دے جہاں ہم اپنے مرنے والوں کی صفِ ماتم بچھا سکیں۔ ہم تو ان کو رو بھی نہیں سکے ہیں۔ اُس کے بعد ہم اپنے آیندہ قیام کے متعلق طے کر سکیں گے"۔

غرض ایک مکان اہلبیتؑ کو دیا گیا اور صفِ ماتم بچھائی گئی۔ حکومت کی ممانعت کے آہنی پردے جو ہٹے تو شریف گھرانے کی کوئی خاتون نہ تھی جو تعزیت کو نہ پہنچی ہو۔ جوانوں حتّٰی کہ شیر خواروں کے تائیدِ حق کا جذبہ اور تین دن کی پیاس کا ذکر، شہدا کی لاشوں کی عُریانی و پامالی کی داستان، قتل و غارت اور آتش زنی و دربدری کا بیان، بے پردگی کا تذکرہ، قید و بند کی صعوبت، دُرّوں کی مار، زبان کے نشتروں کا حال جو

ان خواتین نے سُنا تو سارے دمشق میں ایک ہلچل مچ گئی۔ زینبؑ کی زبان اور علی اکبرؑ کی جوان مرگی کا ذکر، ربابؑ کی دلدوز آہیں اور علی اصغرؑ کے تیر کھانے کی داستان اور جناب سکینہؑ کے رخساروں پر طمانچوں کے نیل کا دلخراش حال۔ پھر کیا تھا انسانیت کے خشک چشمے اُبل پڑے۔ شرافت کے نئے نئے سوتے پھوٹ نکلے۔ جذباتِ انسانی میں ہیجان اور احساساتِ فطرت میں تموّج پیدا ہو گیا۔ جذبۂ اظہار میں یزیدیّت کا مُنھ پھیر دینے کی جراُت و قوت پیدا ہو گئی۔ ہر گھر میں ایک انقلاب کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔ گویا حسینؑ کے نہالِ قربانی میں زینبؑ کی خون باری و جگر کاوی کی بدولت پھل آ گئے اور ابھی اِس صفِ ماتم کو بچھے سات دن بھی نہ ہوئے تھے کہ قصرِ آمریّت کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ اِس صورتِ حال سے گھبرا کر یزیدؔ نے امامِ بیمار کو پھر طلب کیا اور کہا "اب آپ مدینے واپس جائیے"۔ لیجیے مُدّتِ عزا اور جائے قیام دونوں کے متعلق جو آزادی امام کو دی گئی تھی کلّیتہً ختم کر دی گئی۔ بہرحال اسیروں کو رہائی مل گئی اور قافلہ مدینے کے لئے روانہ ہو گیا۔

اللہ اللہ! یہ قافلہ مدینے سے کس اہتمام و احترام سے سدھارا تھا اور اب کس عنوان سے مدینے میں داخل ہونے جا رہا ہے۔ روانگی کے وقت رسولؐ کے خود اپنے گھرانے کے اٹھارہ جوان ساتھ تھے اور واپسی میں صرف ایک مردِ نحیف۔ کیا انقلاب ہے کہ مدینے سے

جب یہ لوگ روانہ ہوئے تھے قافلہ سالار امام حسینؑ تھے۔ اور اب جو پھر یہ مدینے جا رہے ہیں تو قافلہ نعمان ابنِ بشیر کی سرکردگی میں ہے۔ دمشق سے چلتے وقت جناب زینبؑ نے نعمان سے یہ استدعا کی، جی ہاں! استدعا۔۔۔ اِس کے علاوہ اُن کو اب اختیار ہی کیا تھا، کہ اگر تمہارے فرائضِ منصبی میں خلل نہ آتا ہو تو ہم کو کربلا کے راستے سے لے چلو تاکہ ہم اپنے عزیزوں سے آخری بار رخصت ہو لیں"۔ نعمان نے دخترِ رسولؐ کی یہ آرزو پوری کر دی۔ اور اسیرانِ آلِ محمدؐ کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ براہِ کربلا روضۂ رسولؐ تک پہنچا دیا۔

سرزمینِ کربلا پر پہنچ کر جذبات کی جو کیفیت ہوئی اور جو دلدوز مناظر پیش آئے ہوں گے اُس کا اندازہ ہر اہلِ دل کر سکتا ہے۔ مگر جب یہ قافلہ مدینے کے قریب پہنچا اور شہر کی دیواریں نظر آئیں اُس وقت جذبات و احساسات میں جو جزر و مد پیدا ہوا وہ اُس سے بھی بڑھ کر تھا۔ اِدھر کچھ متوحش خبریں سُن کر جنابِ اُمّ البنین چادر اوڑھے گھر سے باہر برآمد ہوئیں تاکہ دریافتِ حال کریں۔ ایک شخص سے پوچھا تو اُس نے یہ سمجھ کر کہ اُن کو اپنے بچّوں کی خیریت کی زیادہ فکر ہوگی کہا "جعفر، علی، عثمان قتل ہو گئے اور ابوالفضل العباسؑ بھی"۔ یہ سُن کر جنابِ اُمّ البنین نے فرمایا "میں اُن سب کا حال کب دریافت کر رہی ہوں جو تم مجھے اُن کی سُنائی سُناتے ہو۔ بتاؤ حسینؑ تو

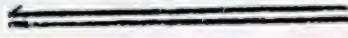
صحیح و سالم اور بخیر و عافیت ہیں ؟" اِدھر جنابِ زینبؑ کا یہ حال کہ کبھی روضۂ رسولؐ کو دیکھتی تھیں اور کبھی مدینے کے در و دیوار کو اور کبھی اپنے اُس جاہ و حشم کو یاد کرتی تھیں جو مدینے سے جاتے وقت تھا اور فرماتی تھیں ۔ " مدینہ ! ہم سے حقیروں کو تو قبول نہ کر "

مدینے میں روضۂ رسولؐ کے سامنے اور محمدؒ بن حنفیہؒ ، ابنِ عباسؓ ، اُمّ البنینؓ ، مادرِ ابوالفضل العباسؑ اور دوسرے اعزّا سے ملاقات کے وقت اِن ستم زدوں کے جذبات میں جو ہیجان ہوا ہوگا اُس کے اظہار پر کس زبان کو قدرت ہوسکتی ہے ۔ ایسے محل پر سرو پا کا بھی ہوش نہ ہو تو کچھ جائے تعجب نہیں پھر بھلا یہ کیونکر یاد رہتا کہ نُعمان نے اِن لوگوں کو کربلا کے راستے سے لاکر جو خدمت انجام دی ہے اُس کا صلہ اُنھیں ملنا چاہیئے ۔ مگر اللہ رے بنتِ زہرؑا کی فرض شناسی اور حمیتِ ہاشمی کہ آپ نے مخدراتِ عصمت و طہارت کے زیوروں کو جمع کر کے سلام اور معذرت کے ساتھ نُعمان کو بھجوادیا ۔ تعجب ہوتا اگر نُعمان اِسے قبول کر لیتا ـــــــــ وہ مرتبہ شناس تھا ۔ اُس نے اپنے مُنہ پر طمانچے مارے اور کہا " ہائے ! میری مجال ہے کہ میں اہلِ بیتِ نبوی کے زیوروں کو ہاتھ لگا سکوں " !!

اللہ اللہ ! چند ہی دنوں میں ایسا انقلاب ! کربلا میں حکومتِ یزیدؔ کی وہ بربریت اور مدینے میں نعمان کی یہ رتبہ دانی اور خوش اخلاقی ! وہاں وہ بے حرمتی اور یہاں یہ احترام !

اور آہ! کربلا کی وہ لوٹ کہ

آدم صفی اللہ سے تا عیسئ دوراں
ایسی نہ لُٹی تھی کوئی سرکار حسینا!!
درّانہ عدو بے ادبانہ ہوئے داخل
گھر فاطمۂ کا ہوگیا بازار حسینا!!





۱۲

عزائے حسینؑ کی افادیّت!!

واقعۂ کربلا کے متعلق مختلف اقوام و ملل کی تقریروں کو اگر دوش ہوا سے اُتار لیا جائے اور اُن کے تصنیف کردہ نظم و نثر کے دفتروں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ایک ایسا گرانمایہ سرمایۂ تاریخ و ادب فراہم ہو سکتا ہے جو اپنی نظیر آپ ہوگا اور یہ بے نظیری اِس بنا پر اور بھی حیرت انگیز ہوگی کہ یہ صورتِ حال حکومت کی پشت پناہی اور سرپرستی کے سہارے نہیں بلکہ بے پناہ جوشِ عقیدت اور والہانہ جذبۂ مودّت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بعض اوقات تو اِس سلسلے میں جو ہوا حکومت کے علی الرّغم ہوا اور گویا سر سے کفن باندھ کر کیا گیا۔ اور جب صدیوں سے ولائے حسینؑ کے مظاہروں کا یہ عالم اور یہ انداز چلا آتا ہو تو حسینؑ کے عقیدتمندوں اور عاشقوں نے اظہارِ حقائق میں کون سی کسر اُٹھا رکھی ہوگی اور کون سے نکتے اور گوشے بیان کرنے سے چھوڑ دئے گئے ہوں گے!!

حسینؑ اور آپ کے اعوان و انصار کی ہمّت و مردانگی، ایثار و قربانی، جُرأت و پامردی، قول کی پاسداری اور عمل کی اُستواری کے کون سے تذکرے بیان نہ کئے گئے ہوں گے اور

اِس طرح ہمارے اقوال و افعال کو بنانے اور سنوارنے کی کیسی کیسی راہیں نہ کھُل گئی ہوں گی ۔ غرض اخلاق و اطوار کی شائستگی ، اقوال و اعمال کی ہم آہنگی کے جو درس کربلا والوں نے دئیے ہیں وہ سبھی تو ہم تک پہنچا دیے ہوں گے ۔ ہاں ! خیال تو یہی ہوتا ہے ۔ اگرچہ واقعۂ کربلا کی اہمیّت اور اُس سے جو معاشرتی ، اخلاقی ، سیاسی اور تمدّنی سبق بنی نوعِ انسان کو ملے ہیں اُن کا احصاء اور احاطہ یقیناً ناممکن ہے ، تاہم جو کچھ سُنا اور پڑھا ہے اُس نے ہم میں انسانیّت اور شرافت کے کیسے کیسے جوہر پیدا کر دئیے ہوں گے ۔

چنانچہ اِس میں شک نہیں کہ حسینؑ کی مجلسوں اور ذکروں کی بدولت بحیثیت مجموعی ہمارا اخلاق کسی دوسری قوم کے اخلاق سے پست نہیں رہا ، بلند ہی ہو گیا ہے —— ہماری عورتوں کا ہلالِ محرّم دیکھتے ہی خود اپنے ہاتھوں سے ایک والہانہ انداز میں اپنی چوڑیاں توڑنا حالانکہ شوہر کی زندگی میں چوڑیوں کا توڑنا اُن کے نزدیک بڑے شک کی بات اور فالِ بد ہے ، یا اپنے ہاتھوں سے اپنے بچّوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں یا پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا اور گلے میں طوق پہنانا یعنی راہِ حق میں اُن کے قیدی بنائے جانے کو گوارا کر لینا ، مہینوں مسلسل اور متواتر غمِ حسینؑ میں اپنا حال تباہ رکھنا اور اشکِ خونیں بہانا ، دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھنا ، عزائے حسینؑ میں غیر معمولی انہماک اور اپنی بساط سے بڑھ کر حسینؑ کی عزاداری میں صرف کرنا ایثار و قربانی اور

مودّت و محبّت کی کچھ ایسی ویسی مثالیں نہیں ہیں۔ اور اگر جنّت صلہ ہے حُسنِ عمل کا تو ایسے اعمالِ حسنہ کے بعد جنّت کا حاصل ہو جانا یقینی ہے خصوصاً جب ہمارے امامِ جعفر صادق کی نصِّ صریح بھی ہے۔

مگر با ایں ہمہ یہ ایک کڑوی بات اور ایک تلخ حقیقت ہے کہ عام طور پہ ہمارے اعمال و اقوال میں کوئی ایسی مناسبت پیدا نہیں ہوئی جس کی بنا پر ہم اپنے کو سچّا حسینی کہہ سکیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم روزِ عاشور اکربلا میں ہوتے تو ہماری صورتِ حال کچھ عجیب ہی سی ہوتی۔ یعنی نہ تو ہم میں حسینؑ کے ساتھ شامل ہونے کی جرأت ہوتی اور نہ یزیدی ٹولی سے مل جانے کی جسارت۔ حسینؑ پر جو مظالم ہوتے اُن پر ہم پیچ و تاب تو ضرور کھاتے مگر اُن کی مدافعت کی ہمّت شاید ہم میں نہ ہوتی، یعنی جو کردار ہمارا فی زمانہ ہو گیا ہے اُس کردار کے ساتھ تو ہرگز نہ ہوتی۔ علی اکبرؑ کی اذان کی آواز سُن کر ہم میں ایک جوش و ولولہ تو شاید پیدا ہوتا مگر اُس کا عملی اظہار نہ کر سکتے۔ جنابِ قاسمؑ کو میدانِ جہاد میں جاتے دیکھتے تو امداد کی اُمنگ ضرور دل میں پیدا ہوتی مگر ہمرکابی کی توفیق نہ ہوتی۔ علی اصغرؑ کا تیرِ سہ شعبہ کھا کر باپ کی گود میں مُسکرانا ہمارے کلیجے کو برماتا تو ضرور مگر حسینؑ کے جذبات کے طوفان کو فرو کرنے کے لئے شاید ہم قدم نہ اُٹھاتے۔ خیموں کی آتش زنی اور لوٹ کے مناظر دیکھ کر ہم تڑپ تو جاتے مگر اعداء کو روکنے ٹوکنے کی ہمت شاید نہ کرتے۔ غرض کربلا میں ہماری حالت

ایک عضوِ معطّل کی سی ہوتی اور ہم آج حسینؑ کی مدد کرنے کی جس آرزو کا اظہار کرتے رہتے ہیں شاید اُس وقت نہ کرتے ۔ تو پھر کیا حسینؑ کے اِس تذکرے سے جو اِس قدر شدّ و مدّ کے ساتھ صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے کوئی فائدہ نہیں ہوا ۔ یہ سب مجلسیں اور جلوس، نوحہ و ماتم، گریہ وزاری جو قرنوں سے ہوتی چلی آرہی ہے سب بیکار رہی ہے اور کیا ہماری اصلاح کے لئے ضرورت ہے کہ ہم کوئی اور موثر یادگار قائم کریں ؟

اگر کسی مستحسن اقدام میں مکمّل کامیابی کا نہ ہونا اِس کی دلیل ہے کہ وہ اقدام بیکار ہے تو یقیناً یہ سب جو اب تک ہوتا رہا ہے بیکار وعبث ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ اِس کی زد میں تو رسول کی رسالت بھی آجائے گی کہ یکساں طور پر تو وہ بھی سب پر اثر انداز نہیں ہو سکی ۔ اگر مادّیت میں چاروں طرف سے گھرے ہونے کے باوجود ہم حسینؑ کی داستانِ غم سنتے سنتے یزیدیت اور بہیمیت سے دُور رہنے کے خواہشمند ہیں اور انسانیت و مظلومیت کا ساتھ دینے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں تو یہ صورتِ حال بجائے خود اِس کا تقاضا کرتی ہے کہ ذکرِ حسینؑ اور شدّ و مدّ کے ساتھ اور زیادہ انہماک سے جاری رکھا جائے ۔ کان میں پڑی ہوئی باتیں بسر جانے کے بعد بھی تحتِ شعور میں تو آخر موجود ہی رہتی ہیں اور کبھی نہ کبھی تو عود کر ہی آتی ہیں ۔ پھر اِن تذکروں کا ایک بہت بڑا فائدہ اجتماع کا ہے ۔ تہذیب و اخلاق

اور ادب و آداب مجلس کے جو فائدے ابتدائے سن ہی سے مجالسِ عزا سے حاصل ہوتے ہیں اور صنعت و حرفت کو ماتمِ حسینؑ سے جو فروغ ہوتا ہے وہ الگ۔ یہ ہے ادنیٰ اِفادیت مجلسِ عزا کی اور غالباً یہی وجوہ ہیں کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ رنج کے موقعوں کے علاوہ اپنی مسرّت کی تقریبوں کو بھی ذکرِ حسینؑ سے زینت دیتا ہے!

لیکن اس پر بھی اگر ہمارا ذوقِ تجدّد اپنی تسلّی کے لئے واقعۂ کربلا کے سوا کسی اور مؤثّر یادگار کے قیام پر مُصر ہی ہو تو بسم اللہ۔ مگر شرط یہ ہے کہ اُس نئی یادگار میں حسینؑ اور اُن کے اعوان و انصار کے خصوصیات سے زاید صفات ہوں۔ ورنہ یہ تجدّد پسندی اہلِ فکر و نظر کے لئے مذاق و طنز کا سامان مُہیّا کرنے کے سوا کسی کام نہ آئے گی۔

آخر حسینؑ کے علاوہ اور کون ہو گا جس نے تا حدِ امکان حفاظتِ جان کی کوشش بھی کی ہو اور اپنی کوششوں کی کامیابی سے نا اُمید ہو جانے پر اپنے منشائے حیات کو پورا کرنے کے لئے بڑی سی بڑی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ بھی کیا ہو۔ لڑائی میں پہل نہ کی ہو، اپنی قلتِ جماعت پر افسردہ نہ ہوا ہو، اور غیروں کی کثرت کا ہراس دل میں نہ آنے دیا ہو، موت سے وقتی طور پر نجات پا جانے کے امکان کے باوجود صدائے حق بلند کرنے اور علمِ صداقت کو اونچا

رکھنے کے لئے جاں بحق تسلیم ہو گیا ہو اور نوعِ انسانی کی عزتِ نفس کو ذلت کی موت مرنے سے بچا لیا ہو۔ یقیناً ایسا حق پرست اللہ کا بندہ حسینؑ کے سوا کوئی نہیں جو اُس مقامِ بلند پر ہو جہاں انسانیت بہمہ وجوہ اپنی حدِ کمال پر جلوہ گر نظر آئے۔

تو پھر ہم اپنی بے توفیقی اور زبوں کرداری کے باوجود کیوں نہ ذکرِ حسینؑ بدستور کرتے رہیں اور ساتھ ہی ساتھ اُس بلند مقصد کو بھی فراموش نہ کریں جو حسینؑ کے پیشِ نظر تھا۔ یہ نہ ہو کہ زبان سے تو ہم حسینؑ حسینؑ کہیں اور ہمارا دل یزیدؔ یزیدؔ پکارے۔ نہ دین کے اُصول سے سروکار ہو نہ فروع سے اور صرف گریہ کو حاصلِ زندگی سمجھ لیں اور غمِ حسینؑ پر آنسو بہا لینے ہی کو متاعِ آخرت!!

بے شک گریہ کی بڑی قدر و قیمت اور اِس کی بڑی افادیت ہے خصوصاً وہ گریہ جو کسی سعادت سے محرومی پر یا مدارجِ بلند حاصل کرنے کے لئے یا کسی مظلوم کی ہمدردی میں ہو کہ ایسا گریہ سوز و دردِ دل کا نتیجہ ہوتا ہے، دل و دماغ کی جلا کرتا ہے، جذباتِ انسانی میں لطیف تلاطم پیدا کر دیتا ہے اور خلوص و ایثار، قربانی و غلوءِ نفس کے صفات کی پرورش کرتا ہے۔ غالباً ایسے ہی "گریہ" کی طرف قرآن نے بھی فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ اور جو آنسو اپنی اُلجھنوں سے پریشان ہو کر نہیں بلکہ دوسروں کی مصیبتوں پر بے قرار ہو کر نکلیں اُن کو بزدلی کی

علامت کہنے کے بجائے بجا طور پر شجاعت انگیز کہا جا سکتا ہے۔
کیا تعجب جو گریہ کی اسی نفسیاتی خصوصیت نے خاصانِ خدا تک کو مناسب محل پر رُلوایا ہو۔ آدمؑ روئے، نوحؑ روئے، یعقوبؑ روئے، محمدؐ روئے، علیؑ روئے، فاطمہؑ روئیں۔ کون نہیں رویا۔ اور علیؑ ابن الحسینؑ تو سعادتِ شہادت سے محرومی اور باپ کی بیکسی کی موت پر تمام عمر روئے!!'
غرض مناسب محل پر گریہ کرنا نہ تو منافیٔ فطرت ہے اور نہ خلافِ شریعت اس کے برخلاف مظلوموں سے ہمدردی اور اُن کی داستانِ غم سُن کر محزون و دل ملول نہ ہونا سنگدلی کی علامت ہے اور چونکہ حسینؑ سے بڑھ کر زمانے میں کوئی مظلوم نہیں لہذا آپ کے مصائب پر اشک ریز یا کم از کم پُرغم نہ ہونا تو ایک نوع کی کُھلی ہوئی شقاوت بھی ہے!!
مگر، **خطا معاف!** اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم تمام محاسنِ انسانی و اسلامی کو آنسوؤں کی رَو میں بہا دیں، نواہی کو اپنا شعار بنا لیں اور حسینؑ کا تذکرہ سن کر چند آنسو بہا لینے ہی کو اپنی بد اعمالیوں کا کفارہ قرار دے لیں۔ یاد رہے کہ بے معرفتِ محبوب اُس سے محبت ہو ہی نہیں سکتی حسینؑ سے محبت ہے تو ہمارے قول و عمل میں حسینؑ کے قول و عمل کی صداقت و قوت کی جھلک ہونا چاہیئے اور ہمارے دل میں اُن کی تاسی کا جذبۂ خالص! پھر تو ہمارے آنسوؤں کے پسِ پشت اعمال کی گراں مائگی بھی ہوگی اور قول کی جان داری بھی۔ اور جب یہ ہوگا تو ہمارے

آنسو وہ گوہرِ بے بہا ہوں گے جن سے یقیناً جنّت بھی خریدی جاسکے گی اور جن کی قدر و منزلت بے شک وشبہ جنابِ فاطمہؑ کی نگاہِ اعتبار میں بھی ہوگی! یہ کردار و شعار جب ہمارا ہوگا تو پھر کوئی بڑا ہی سخت دل اور بدنفس ہوگا جو ہمارے رونے کا مذاق اُڑائے یا ہمارے نوحہ وماتم پر حرف گیری کرنے کی جرأت کرے۔ اُس وقت تو ہمارے ضمیر کی پاکی سے ہمارے بیان میں وہ اثر ہوگا کہ خود سننے والوں کے قلب اُلٹ جائیں گے۔ اور کیسے نہ اُلٹیں گے۔ آہ! کربلا کے دل ہلادینے والے واقعات بیان ہوں اور دل نہ اُلٹیں! عصرِ عاشورا کے اُس عالمِ تنہائی میں علی اصغرؑ کی ننھی سی لاش لے کر حسینؑ کے خیمے کی طرف بڑھنے اور پلٹنے کا المناک منظر پیشِ نظر لایا جائے اور دل نہ اُلٹے! بعدِ قتلِ حسینؑ سکینہؑ کا باپ کی لاش کی تلاش میں بے سروسامانی کے عالم میں مقتل میں سرگرداں پھرنے کا بیان ہو اور دل نہ اُلٹے! حسینؑ کے تہِ خنجر بھی ذکرِ الٰہی میں مصروف ہونے کا حال معلوم ہو اور دل نہ اُلٹے! آہ! کوئی رودادِ خونچکاں ایسی بھی ہے جس کا ذکر ہو اور دل نہ اُلٹے، آنسو نہ اُمڈیں اور کلیجہ مُنہ کو نہ آئے!!

اربابِ وِلا! ذرا انصاف تو کرو کہ جب کربلا کا یہ نفسیاتی دلدوز منظر سامنے آئے گا تو دل کیسے نہ اُلٹے گا۔ اُدھر علی اکبرؑ اہلبیتؑ سے رخصت ہو کر خیمے سے نکلے، اِدھر اُن کے ساتھ لیلیٰ کی آرزوؤں اور ارمانوں کا جنازہ نکلا۔ اُدھر علی اکبرؑ اذنِ جہاد کے لئے باپ

کے سامنے کھڑے ہوئے، اِدھر لیلیٰ نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ اُدھر حسینؑ نے رسولؐ کی تمثال پر آخری نظر ڈالی، اِدھر لیلیٰ نے مامتا سے بھری ہوئی نگاہوں سے علی اکبرؑ کی بلائیں لیں۔ اُدھر رسولؐ کی تصویر کے برباد کئے جانے کے اندیشے سے حسینؑ پژمردہ دل، اِدھر لیلیٰ علی اکبرؑ کی بھرپور جوانی کے خاک میں مل جانے کے تصور سے لرزہ براندام۔ اُدھر حسینؑ نے اسلام کی روشن مستقبل کے تصوّرات میں اپنے کو گُم کر دیا، اِدھر لیلیٰ اپنے تاریک مستقبل کے تخیّلات میں کھو گئیں۔ حسینؑ اور لیلیٰ کے تصوّرات کی نوعیت گو مختلف تھی۔ مگر لیلیٰ جانتی تھیں کہ حسینؑ امام ہونے کے ساتھ ساتھ آخر باپ بھی تو ہیں۔ لہذا اُدھر حسینؑ نے علی اکبرؑ کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنایا تو اِدھر لیلیٰ نے حسینؑ کے چہرے پر نظریں جما دیں تاکہ آپ کے چہرے پر جذبات واحساسات کے مدّ وجزر سے اپنے نورِ نظر کے جوشِ جہاد کے چڑھاؤ اُتار کا اندازہ کر سکیں۔ اُدھر حسینؑ کا چہرہ اکبرؑ کے شجاعانہ جہاد سے فروزاں ہوا۔ اِدھر لیلیٰ کے چہرے پر بھی رونق آئی۔ اُدھر شبیہ پیغمبرؐ کو اعدا کے جھرمٹ میں دیکھ کر حسینؑ کے چہرے کا رنگ اُڑا تو اِدھر لیلیٰ کا چہرہ بھی فق ہو گیا اور بالآخر جب حسینؑ یَا اَبَتَاهُ عَلَيْكَ مِنِّي السَّلَامُ کی آواز پر کلیجہ تھام کر میدانِ قتال کو دوڑے تو لیلیٰ کو کھ پکڑ کر

خیمے کے اندر بھاگیں - خیال ہو سکتا ہے کہ وہاں جا کر آہ و زاری میں مصروف ہو گئی ہوں گی - مگر وہ تو سجّادے پر قبلہ رُو کھڑی ہو گئیں - کیا عجب جو یہ کہہ رہی ہوں کہ بارالٰہا میں نے اور میرے بچّے نے حق کی حمایت کا عہد پورا کر دیا اب تو بھی اپنی شانِ کریمی کا اعجاز دکھا اور اس ہدیۂ حقیر کو قبول فرما !!

لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین،
خصوصاً یزیدِ و آلہٖ الضالّین !!

اے کہ گفتی بر یزید و آلِ اُو لعنت مکُن
زانکہ شاید حق تعالیٰ کردہ باشد رحمتش
اُن چہ با آلِ نبی اُو کرد گر بخشد خدا
ہم یہ بخشاید تُرا گر کردہ باشی لعنتش !!